سلسلۂ انتخاب نیرنگِ خیال

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟

مرتبہ

حکیم محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر رسالہ نیرنگِ خیال لاہور

ناشر

دار الادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور

بار اول ایک ہزار قیمت ایک روپیہ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام
ضمیر احمد خان پرنٹر چھپی
اور مسٹر یعقوب الحسن پبلشر و مالک دار الادب پنجاب نے شائع
٭ کی ٭

پیش لفظ

"میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" کے موضوع پر ہندوستان میں یہ اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔اس عنوان پر ہندوستان کے چند مشہور افسانہ نگاروں نے اپنے جذبات اور خیالات پیش کئے ہیں۔

ان مضامین کے مطالعہ سے افسانہ اس کے کرداروں، اس کی نشوونما اور اس کی تکمیل کی نہایت دلچسپ داستان قلمبند ہوتی ہے۔موضوع کہانی سے دلچسپ نہیں۔

یورپ میں اس قسم کے مضامین بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔اس لئے توقع ہے۔کہ ہندوستان میں بھی یہ کوشش پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائیگی

اس پیش لفظ میں خاکسار اپنی رام کہانی ہی لکھنا پسند کرتا ہے۔کیونکہ اس موضوع پر دوسروں کے انداز پر بحث تمحیص کی نسبت آپ بیتی کو پیش کرنا زیادہ دلچسپ ثابت ہوگا۔

ہمارے ادب میں افسانہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔مشکل ہی سے کوئی ایسا اہل قلم ہوگا۔جس نے اپنی عمر میں کبھی ایک آدھ افسانہ نہ لکھا ہو۔بلکہ ہمارے اچھے سے اچھے اہل قلم کی ابتدائی مشق افسانہ نگاری ہی سے شروع ہوئی ہوگی۔اس کے بعد ہر ایک نے اپنی جولانئی طبع کے لئے کوئی مخصوص طرز یا عنوان پسند کر لیا ہوگا۔اور ترقی کے میدان میں بڑھتے بڑھتے نہ معلوم وہ کہاں سے کہاں جا پہنچا ہوگا۔

اس سے یہ مطلب نہیں ہے۔کہ افسانہ نگاری میں زیادہ ترقی کی گنجائش نہیں۔یا یہ عنوان پست ہے۔لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایک ادیب کے لئے ابتدائی مشق کے لئے یہ عنوان ضرور موزوں ہے۔اور بادی النظر میں اپنے اندر بہت سی آسانیاں بھی رکھتا ہے۔لیکن ترقی کے میدان میں افسانہ نگاری اپنی انتہائی منزلیں بھی رکھتی ہے۔چنانچہ بعض اہل قلم نے اسی عنوان پر جگر ریزی کر کے بلند

نام پیدا کیا۔ ؎

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

"میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"، یہ سوال نہ مشکل ہے، نہ پیچیدہ۔ اس کے لئے جذباتی دنیا کی سیر کی ضرورت نہیں نہ رومان انگیز حادثات کا پیش آنا لازمی ہے۔

میرے افسانے جن کی تعداد ستر اسی کے قریب ہوگی، تین اقسام پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ترجمہ (۲) اخذ (۳) حقائق

ترجمہ شدہ افسانوں میں اس کے سوا کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ کہ میں نے کوئی افسانہ پڑھا۔ مجھے پسند آیا۔ فرصت ملی تو اس کا ترجمہ کر دیا۔ میرے ترجمہ شدہ افسانوں میں سبھی رنگ کے افسانے موجود ہیں۔

اخذ شدہ سے یہ مراد ہے۔ کہ کسی غیر زبان کے افسانہ کا پلاٹ ماحول یا اس کا کوئی خاص ٹچ پسند آنے پر ایک افسانہ کی بنیاد رکھی اسے ہندوستانی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھال کر اس طرح سے پیش کر دیا۔ کہ وہ خالص ہندوستانی افسانہ معلوم ہونے لگا۔

تیسری قسم حقائق کی ہے۔ یعنی وہ افسانے جو میرے ذہن و فہم کی تخلیق ہیں۔ اور یہی میرے افسانوں کا اصلی رنگ ہے۔

میرے سچے افسانے مرتب ہوتے ہیں۔ سنی سنائی خبروں یا بعض لوگوں کے بیان کردہ حالات سے کبھی کبھی کسی ان ہونی بات کا بھی ان میں ذکر آ جاتا ہے۔ مگر وہ دنیاوی حالات کے زیر اثر میرے خیال میں ممکنات سے ہوتے ہیں، بعض پلاٹ ایسے ہیں جو میرے خیال میں حوادث روزمرہ کی طرح ہیں۔ بعض ایسے نقائص یا مظالم ہیں۔ جو سوسائٹی میں گھر کر چکے ہیں۔ میں ان سے متاثر ہو کر ایک افسانہ مرتب کر لیتا ہوں۔ اس قسم کے جملہ پلاٹس جو مجھے اخباری خبروں، مصیبت زدہ اشخاص کی آپ بیتیوں عدالتوں کے فیصلوں وغیرہ سے ملتے ہیں۔ اپنے اندر ایک دو سطروں سے زیادہ مواد نہیں رکھتے۔ مثلاً میں ایک خبر پڑھتا ہوں۔

لکھنؤ۔ دریا کے کنارے ایک لفافہ پڑا ملا۔ جس میں ایک بھائی بہن کے خودکشی کر لینے کا تذکرہ ہے۔ جنہوں نے دنیا کے مصائب سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ دونوں لاشیں مل گئی ہیں۔

اتنی سی خبر پڑھنے کے بعد میرے اندر ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ کہ وہ کونسے حالات ہو سکتے ہیں۔ جب بھائی بہن خودکشی کرنے پہ مجبور ہوں۔ سوسائٹی نے ضرور انہیں تنگ کر دیا ہو گا۔ اور وہ ہمارے سوشل نظام میں زندوں کی طرح چل پھر نہیں سکتے ہوں گے۔ ان پر انگلیاں اٹھتی ہوں گی۔ قصہ کوتاہ صرف اتنی سی خبر پہ میں ایک افسانہ کی تخلیق کرتا ہوں۔ یہ افسانہ بھائی بہن کی خودکشی کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اور اب سوسائٹی کے گناہ نامی افسانوں کی کتاب میں موجود ہے۔

میرے تخلیقی افسانے کا پلاٹ مجھے ہوا میں لڑھکتا ہوا، کانوں کے اندر گونجتا ہوا، اخباری خبروں سے لپٹا ہوا مل جاتا ہے۔ یہ ذرا سی چیز ملتے ہی کھٹکنے لگتی ہے۔ میرے امن و سکون کے راستہ میں الجھنے لگتی ہے۔ طبیعت کو بے چین بنا دیتی ہے۔ انسانی بے راہ روی اور ظلم و ستم کی داستانیں میری آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔ اور جی چاہنے لگتا ہے۔ کہ میں اس پہ ایک کہانی لکھوں۔ سوسائٹی کے مظالم کو بے نقاب کر دوں۔ یہ جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور پھر افسانہ لکھنا کچھ مشکل کام نہیں رہتا۔

افسانہ شروع کرنے سے قبل اس کا انجام اور پلاٹ میرے سامنے ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ کرداروں کے نام اور دوسری چیزیں لکھتے وقت سوجھتی جاتی ہیں۔ اور افسانے کے درمیان کی تمام کڑیاں بھی لکھتے وقت ہی سامنے آتی جاتی ہیں۔ اور انہیں افسانے کو رنگ دینے اور دلچسپ بنانے کے لئے کام میں لاتا جاتا ہوں۔

افسانہ کے ابتدائی ایک دو پیراگراف لکھتے ہوئے کچھ دقت سی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ سطریں لکھ کر کاٹتا ہوں۔ پھر لکھتا ہوں۔ دو چار دفعہ کی کوشش کے بعد طبیعت ابھرتی ہے۔ پھر قلم فرفر چلنے لگتا ہے۔ میں ایک افسانہ کو نا تمام نہیں چھوڑ سکتا۔ آج کا کام کل پہ نہیں ٹال سکتا۔ خواہ افسانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ میں اسے ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لوں گا۔ پندرہ منٹ صرف

ہوں یا ۵ گھنٹے بغیر ختم کئے میں اسے چھوڑ ہی نہیں سکتا۔
لکھتے وقت میری عادت ہے۔ کہ میں افسانے کو بار بار پڑھتا جاتا ہوں۔ ایک پیراگراف لکھا اسے پڑھا۔ پھر دوسرا پیراگراف لکھا۔ اسے پڑھنے کے بعد تیسرا پیراگراف پھر پڑھوں گا۔ کبھی دو دو اور تین تین بار بھی پڑھتا ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صفحہ مکمل کرنے کے بعد پڑھا۔ پھر دوسرے صفحہ پر کچھ لکھا۔ پھر پہلا صفحہ تمام کا تمام اور دوسرے صفحہ کا کچھ حصہ پڑھنے کے بعد لکھنا شروع کروں گا۔ اور تیسرے کو شروع کرنے سے قبل پھر پہلا اور دوسرا صفحہ پڑھوں گا۔ یہ سلسلہ آخر تک جاری رہے گا۔ اس طرح پڑھتے رہنے سے میرا تخیل قائم رہتا ہے۔ اور ذہن میں غیر خیالات نہیں آتے۔

باوجود بار بار پڑھنے کے میں تیز نگار بھی ہوں۔ ایک دن ۸ گھنٹوں میں کبھی دو اور تین افسانے بھی لکھ سکتا ہوں۔ مگر عام طور پر ایک دن میں ایک ہی افسانہ لکھوں گا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک طبیعت لکھنے پر مائل نہ ہوگی۔ عام قاعدہ یہی ہے۔ لیکن طبیعت پر جبر کر کے کسی خاص مجبوری کی بنا پر ہفتہ میں یا ایک دن میں تین افسانے بھی لکھے جا سکتے ہیں۔

میرے افسانوں کی خصوصیت ہندوستانی معاشرت اور رسم و رواج کی دکھ بھری کہانیاں ہیں، ہمارے محلے میں آپ کے محلے میں، ہمارے شہر میں آپ کے گاؤں میں ہر جگہ نت نئے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو بھی میرے کانوں تک پہنچیں۔ اور جن سے میں متاثر ہو جاؤں ان پر ایک کہانی لکھ کر جی کی بھڑاس نکال لیتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں۔ کہ سوسائٹی اسے پڑھے اس سے متاثر ہو۔ اور وہ اپنے رستے ہوئے ناسور کے علاج پر مائل ہو۔ ہماری سوسائٹی میں وسعت خیال۔ اعلیٰ اخلاق اور انصاف کے اوصاف پیدا ہوں۔

میرے یہ سچے افسانے مواعظ دینی کا مجموعہ نہیں ہیں۔ مجھے صرف واقعات کو ایسے رنگ میں آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ کہ آپ ان سے متاثر ہوں۔ میں نصائح کی زبان نہیں کھولتا نتائج اخذ کرنا ناظرین کے دماغ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ فنی نکتہ نظر سے یہ افسانے بے حد سراہے

گئے ہیں۔

میرا سب سے پہلا افسانہ مولوی محبوب عالم صاحب کے ہفتہ وار ادبی رسالہ انتخاب لاجواب میں چھپا تھا۔ اس کا نام تھا "پر اسرار عمارت" یہ ایک بھوتوں کا قصہ تھا۔ جو میں نے افسانہ کے رنگ میں پیش کیا تھا۔ ان دنوں میں سیکنڈ مڈل (ساتویں کلاس) میں پڑھ رہا تھا۔ مولوی محبوب عالم صاحب کو یہ افسانہ اس قدر پسند آیا۔ کہ انہوں نے مجھے ملاقات کے لئے بلایا۔ لیکن میری عمر اس وقت $\frac{14}{15}$ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ حیران سے ہوئے۔ اور یہ ملاقات تین چار منٹ سے زیادہ نہ رہی۔ آپ نے بزرگانہ لہجہ میں فرمایا "بیٹا ابھی تم پڑھو۔ ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔" میرا خیال کچھ اور تھا۔ مجھے سب ایڈیٹر کی ضرورت تھی، "پڑھتے رہو، اور خوب پڑھو"

چنانچہ میں واپس چلا آیا۔ اور مولوی محبوب عالم کا وہ کارڈ جس کے ذریعہ انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ چند سال تک میرے لئے باعث فخر و عزت بنا رہا۔

چند سالوں کے بعد میں نے دوسرا افسانہ حضرت خواجہ حسن نظامی کے ہفتہ وار اخبار توحید میں لکھا۔ جہاں ایک انعامی سلسلے کا اعلان ہوا تھا۔ ایک اشرفی انعام سب سے اچھے افسانہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ خدا کی قدرت کہ میرا ہی افسانہ سب سے اچھا رہا۔ اس افسانہ کا عنوان تھا۔ فرانسیسی ڈیوک کا اکلوتا لاڈلا۔ لاہور کے ایک رسالہ گلشن میں کئی افسانے شائع ہوئے۔ مگر ان میں سے کسی کا بھی ریکارڈ موجود نہیں۔ اس کے بعد یوپی کے مشہور رسالہ زمانہ میں ۵ - ۶ افسانے لکھے۔ یہ سب ترجمہ تھے۔

زمانہ کے بعد مخزن میں دو تین افسانے لکھے۔ پھر ایک افسانہ ہمایوں میں چھپا۔ اس کا عنوان تھا۔ حیات ثانی۔

زمانہ مخزن اور ہمایوں کے بعد میں نے نیرنگ خیال جاری کیا۔ جس میں کبھی کبھی کوئی افسانہ لکھ دیتا تھا۔ میرے افسانوں کی تعداد ستر اسی کے قریب ہو گی۔ جن میں سے مشکل

سے ۴/۵ ملتے ہیں۔ ایک مجموعہ سوسائٹی کے گناہ کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ جس میں ۲۰ کے قریب افسانے ہیں۔ جن میں بعض کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو چکا ہے ؛

یہ ہے میری افسانہ نگاری کی داستان اب آپ ملک کے نامور اور مشہور افسانہ نگاروں کے خیالات مطالعہ فرمائیے۔

حکیم یوسف حسن

منشی پریم چند

بندہ نواز تسلیم! یاد آوری کا مشکور ہوں۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں آپ کی فرمائش کی تعمیل نہ کر سکا۔ کچھ تو عدیم الفرصتی کا مرض دامنگیر ہے۔ اور کچھ حافظہ کی کمزوری اب کوشش کرتا ہوں۔

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض کسی واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جبتک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی۔ میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے

مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں جما نہ لوں۔ لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کریکٹروں کا اختراع اسی اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پرُسطوت واقع پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے 'دل کی رانی' میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اسکی شادی کا ذکر ہے مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس نہ تھا۔ وہ کلائمکس کیسے پیدا ہو اسکی فکر شروع ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فن حرب کی تعلیم

پائی تھی۔ اور میدان جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا، تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہو گئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا تھا، تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں، اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جا سکتی ہے لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور رنگین عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنا پر افسانہ نہیں ہوتا میں اس میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے جب کوئی ایسا موقع آ جاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے، تو میں

واقعہ سے ضرور فائدہ اٹھانیکی کوشش کرتا ہوں یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں بہت سست رفتار ہوں، مہینے بھر میں شاید میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔

مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقوق نہیں بیان کر سکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے۔ سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بنجاتے ہیں، لیکن شاعری کی طرح اس کے لئے بھی اور ادب کے ہر ایک شعبہ کے لئے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے ڈرامیائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے خود کچھ ندرت،

کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی
قوت کا احساس ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ
سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا، حالانکہ فیل اور
پاس دونوں افسانے شائع ہوجاتے ہیں اور اکثر ایسا
ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب
نے بہت زیادہ پسند کیا ہے، اس لئے میں اپنے معیار پر زیادہ
اعتبار نہیں کرتا۔"

خواجہ حسن نظامی

حسن نظامی افسانہ کیونکر لکھتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ

جس طرح خدا لکھواتا ہے

اور اس طرح جیسے خود خدا اس کائنات محسوسہ کے افسانے تصنیف کرتا ہے۔ کیونکہ اس موجودہ و معلومہ و محسوسہ دنیا کا ہر وجود موجود و محسوس خدا کی تصنیف کا ایک افسانہ ہے اور میں خود بھی خدا کی تصنیف کا ایک قصہ ہوں۔

نئے سائنس کی تحقیقات پر یقین کرنے کو جی تو نہیں چاہتا، مگر یقین کئے لیتا ہوں کہ پہلے خدا نے دنیا پیدا کرنے

کا یا کائنات کا قصہ لکھنے اور اس کو بصورت ڈرامہ وجود کے
اسٹیج پر دکھانے کا ارادہ کیا تو ایک غبار نمودار ہوا اس کے
بعد وہ غبار پانی بن گیا اور توریت میں خود خدا نے فرمایا ہے
کہ پہلے دنیا میں پانی تھا اور خدا کی روح اس کی موجودگی میں
جنبش کرتی تھی۔ پھر اس پانی سے نباتات جمادات حیوانات
پیدا ہوئے، پھر انسان پیدا ہوا۔ اور انسان کی صورت میں خدا
نے اپنی صورت نمودار کر دی۔ اور اس میں الٰہی صفات کا رنگ
بھر دیا۔ اور ہر انسان میں ہزاروں افسانے دفن کر دیئے۔

میں حق تعالیٰ خدا کا ایک بندہ ہوں۔ مگر خدا کی صفت
تخلیق کے ارتقا کا ایک نمونہ اور اس کی مشیت کی ایک شکل بھی
ہوں۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں قصے لکھنے کا شوق ہوا، مولانا شرر کے
ناول اور مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کی کتابیں پڑھ کر بغیر کسی
کی شاگردی اور صلاح اور رہبری کے لکھنا شروع کیا۔

آٹھ برس کی عمر میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا
تھا لیکن اماں کی سنائی ہوئی کہانیاں دل و دماغ پر نقش

تھیں اور دنیا کے ابتدائی غبار کی طرح ذہن پر انکی گھٹا چھائی رہتی تھی۔ وہ کہانیاں جڑے چپڑ باکی نہ تھیں (تھوڑی بہت تھیں تو ان کا عدم وجود برابر ہے) بلکہ دہلی کے بادشاہ اور لال قلعہ اور غدر کے ہنگامہ کی کہانیاں تھیں۔ جو انہوں نے میرے نانا اور اپنے باپ سے سنی تھیں۔ جو بہادر شاہ بادشاہ کے پاس لال قلعہ میں اکثر جایا کرتے تھے اور جب ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بادشاہ لال قلعہ سے نکل کر پہلے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں آئے تو نانا صاحب ہی سے ان کی آخری باتیں ہوئی تھیں۔

الغرض میری افسانہ نویسی کی پیدائش ان کہانیوں سے گھر سے ہوئی، پہلے لکھنا نہ آتا تھا، یعنی کسی بات یا واقعہ کو اس طرح نہ لکھ سکتا تھا، جو سب کی سمجھ میں آجائے یا میں سمجھ سکوں کہ جو مطلب ادا کرنا چاہتا تھا وہ ادا ہو گیا، لیکن رفتہ رفتہ مشق بڑھ گئی اور میں نے شاہی خاندان اور لال قلعہ کے گذرے ہوئے سنچے قصوں سے افسانہ نویسی شروع کی اور یہ چھوٹے چھوٹے قصے "بھکاری شہزادی" "بنت بہادر شاہ" وغیرہ عنوانوں سے

اخباروں میں شائع ہوئے تو ان کی خوب دھوم ہوئی اور مجھے خوب داد ملی۔

اس وقت تک میں نے قصہ نویسی کے کسی مقررہ قاعدہ اور اصول کو سنا بھی نہ تھا۔ بلکہ اپنے مشاہدہ یا سُنی ہوئی بات کو قلم بر داشتہ لکھ دیتا تھا اور اخباروں میں بھیج دیتا تھا۔

پھر جب حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب اکبرؔ الہ آبادی سے ملاقات ہوئی اور انکی شفقت میرے حال پر بہت بڑھی تو ایک دن انہوں نے قصہ نویسی کی نسبت مجھ سے فرمایا کہ "قصہ نویس فطرت کو اپنی خواہش پر چلنے اور چلانے کی تمنا کرتے ہیں یعنی ایسی باتیں قصوں میں لکھتے ہیں جو روزمرہ کی انسانی سرگزشت کے خلاف ہوتی ہیں۔ اور قصہ نویسوں کی یہ تمنا یہ خواہش رفتارِ فطرت کے خلاف ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ فطرت کے ساتھ ایک گستاخی کرتے ہیں جو اس سے کہتے ہیں کہ اس طرح چل جس طرح ہم نے قصہ بنایا ہے۔

حضرت اکبرؔ کی یہ بات سنکر مجھے اپنے افسانوں کی تحریر

میں احتیاط ہوئی اور میں نے رنگ آمیزی کرنے اور قصہ کا اثر بڑھانے کے لئے ایسی باتیں لکھنی چھوڑ دیں جو واقعات مقررہ کے خلاف ہوتی تھیں۔

پہلے میں اماں سے سُنی ہوئی باتوں کو سادہ الفاظ میں لکھا کرتا تھا۔ پھر واقعات کو موثر انداز میں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بعد یہ خیال ہوا کہ اگر واقعہ معمولی ہے تو اس میں اثر پیدا کرنے کے لئے غلط باتیں بھی بڑھائی جائیں تاکہ قصہ مزہ دار اور اثر دار ہو جائے۔ کیونکہ گناہ میں نیکی سے زیادہ لذت ہوتی ہے یا گناہ کے بیان میں نیکی کے بیان سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر گناہ مخفی ہوتے ہیں اور وہ گناہ کی باتوں کو اپنے آئینۂ مخفی میں دیکھ کر متاثر اور مسرور ہوتا ہے۔

دنیا میں جس قدر قصے لکھے جاتے ہیں یا پہلے لکھے جاتے تھے ان کا کمال یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ بہت زیادہ جھوٹے اور خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہوں، اور حیرت میں ڈالنے

والے ہوں۔

بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ اور مہابھارت کے قصے عقل کو عاجز کرنے والے جھوٹ کے سبب سے بہت مقبول و مروج تھے مگر جب یورپ کی نئی روشنی یہاں آئی تو وہ جھوٹ بولنے کی ایک حکمت بھی اپنے ساتھ لائی اور لوگ جھوٹ کے اوپر سچ کو اس طرح لپٹنے لگے جیسے کونین کی گولی پر میٹھاس لپیٹ دیتے ہیں یعنی وہ اس طرح جھوٹ بولنے لگے کہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کو بالکل سچ معلوم ہونے لگے۔

میں بھی نئی روشنی کی اس عام وبا میں مبتلا ہوا اور قصہ نویس کے جھوٹ کو سچ کی صورت میں پیش کرنے لگا۔ اور جھوٹ پر جان دینے والی دنیا میرے قصوں پر مرنے لگی۔ اور ان کی اتنی زیادہ قدر ہوئی جو میرے زمانہ کے قصہ نویسوں سے کچھ زیادہ تھی۔

دہلی میں پیدا ہوا تھا جہاں سولہ سو عورت مرد اور بچے تیموریہ خاندان کے شہزادوں کے رہتے ہیں۔ اور میرے گھر میں بھی

شاہی خاندان کے کچھ افراد میری خدمت اور پرورش کے شریک تھے۔ ان کو دیکھتا تھا۔ ان کے قدیمی حالات کا تصور جماتا تھا۔ اور قلم لے کر ایک قصہ لکھنا شروع کر دیتا تھا۔

لکھنے سے پہلے کوئی واقعہ یا کوئی سچی سرگذشت خیال میں نہ ہوتی تھی۔ اور مجھے یہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہ کیا لکھوں۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکالوں۔ کیونکہ اصلیت تو ذہن میں ہوتی ہی نہ تھی۔ لیکن لکھنا شروع کرتے ہی قصہ خود بخود الفاظ میں ڈھل ڈھل کر سامنے آنے لگتا تھا۔ اور کسی نامعلوم قوت سے اسکی ایک ایسی صورت بن جاتی تھی کہ پورا کرنے کے بعد وہ بالکل سچا اور گذرا ہوا واقعہ معلوم ہونے لگتا تھا

درد اور سوز اور غم کا اثر قصہ میں دماغی امد سے پیدا نہ ہوتا۔ تو میں گراموفون مشین پر کسی مرثیہ کا ریکارڈ بجاتا اور اس کو سنکر میرے اندر غم کی لہر پیدا ہو جاتی اور قصہ کو غم آلود اور غم پاش بنانے میں مجھے آسانی ہو جاتی۔

"عرب شہید کا گھر ایک مختصر افسانہ ۱۹۱۲ء کے

اخبار زمیندار میں شائع کرایا تھا۔ جو تمام اخبارات میں نقل ہوا تھا اور ہندوستان میں اسقدر مقبول ہوا تھا کہ ہر جگہ اس کا چرچا تھا۔ وہ قصہ میں نے آغا حشر کے ایک ڈرامہ کو دیکھنے کے بعد لکھا تھا۔ رات کو دو بجے ڈرامہ دیکھ کر واحدی صاحب کے مکان پر آیا جہاں اس زمانہ میں رہتا تھا۔ واحدی صاحب سو گئے۔ اور میں نے یہ قصہ لکھا۔ اور صبح تک اپنے لکھے ہوئے فرضی قصہ کو پڑھ پڑھ کر روتا رہا۔ اور اکثر یہ ہوا کرتا تھا کہ میں غمگین قصے لکھ کر پڑھتا تھا اور رویا کرتا تھا۔ اور جب یہ خیال آتا کہ یہ تصور تو جھوٹا ہے۔ تب بھی دل کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ اسکو پڑھوں اور روتا رہوں۔ کیونکہ رونے میں ایسی لذت آتی تھی جو اب ہنسنے میں نہیں آتی۔

اب میں افسانہ لکھنے کے وقت یہ کوشش کرتا ہوں کہ واقعہ قطعی جھوٹا نہ ہو کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہو۔ اور میں ایک ذرہ کو آفتاب بنا دوں اور اسی بات کو اپنا کمال سمجھوں۔ آج کل اعصاب کی کمزوری اور بڑھاپے کی عمر اور یہ

افکار و مشاغل کی کثرت کے سبب تصور کی قوت کم ہو گئی ہے اس لئے جب کوئی قصہ لکھنا پڑتا ہے تو کچھ دیر تصور جما کر کسی اصلی واقعہ کو با اثر کرنے کے لئے بے اصل واقعات تصنیف کرتا ہوں ۔ اور ان سب کا خاکہ دماغ میں تیار کر کے کاغذ پر لکھ دیتا ہوں ۔

البتہ جب کوئی آواز یا صورت یا واقعہ یا خبر میرے دل پر اثر کرے تو سوچنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی ۔ اور ابتدائی عمر کی طرح قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہوں ۔ اور نہیں جانتا کہ کیا لکھنا چاہتا ہوں ۔ اس مضمون کے لکھنے میں بھی یہی کیفیت پیش آئی تھی ۔

ایم اسلم

پیشتر اس کے کہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کروں میں سب سے پہلے یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ میں فرمائش پر افسانہ نہیں لکھ سکتا، اگر کوئی یہ چاہے کہ جب مجھ سے کہا جائے میں قلم لے کر بیٹھ جاؤں، اور ایک افسانہ تیار کر دوں، یہ میرے لئے بہت ہی مشکل ہے۔

عام طور پر مجھے افسانے کے لئے پلاٹ تین چیزوں سے سوجھتا ہے یا تو کوئی اداس فضا ہو، یا کوئی ٹوٹا پھوٹا غیر آباد مکان ہو، یا راہ چلتے کوئی ایسا شخص نظر آ جائے جو حقیقی معنوں میں صورت سوال ہو۔

میرے افسانے جن میں درد اور محبت کی تصویر عریاں ہوتی ہے وہ کسی ایسی ہی فضا کا نتیجہ ہوتے ہیں جہاں خاموشی

اور اداسی مسلط ہو بھوت پریت کے افسانے مجھے کوئی ٹوٹا پھوٹا غیر آباد مکان دیکھ کر سوجھتے ہیں، اور جب کسی شخص کا تصور میری آنکھوں کے سامنے ہو تو میں وہ افسانے لکھتا ہوں جنہیں ازدواجی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

دنیاوی نقطہ نگاہ سے چونکہ میں ایک بیکار آدمی ہوں اس لئے وقت کاٹنے کے لئے میں نے دو شغل اختیار کر رکھے ہیں، ایک شکار دوسرا گراموفون۔ اور میں اکثر افسانے گراموفون کے ریکارڈوں سے متاثر ہو کر لکھتا ہوں جب کوئی خاص راگ یا کسی ریکارڈ کا کوئی خاص شعر مجھے پسند آئے تو میں اُسے بار بار سنتا ہوں، بلکہ کئی کئی دن وہی ایک ریکارڈ سنتا رہتا ہوں۔ اور پھر اس راگ یا اس شعر کا جو اثر میرے دل و دماغ پر پڑتا ہے تو اس کے مطابق مجھے کوئی افسانہ سوجھتا ہے۔

مس اندوبالا کا ریکارڈ ؎

جگ جھوٹا سارا سائیاں!

اور زہرہ کا ریکارڈ ؎

جب سے پیا پردیس گنوں کینو!

یا ع آنکھیں ترسن تیرے دیکھن کو

میں نے اکثر افسانے انہی قسم کے ریکارڈوں سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ میری طبیعت میں "احساس" کا مادہ تو اس کثرت سے ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس ایک نقص نے مجھے نکما کر دیا ہے۔ تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا، ذرا سی بات سے میرے دل کو ٹھیس سی لگتی ہے۔ چنانچہ میرے دل کی کیفیت کا پورا پورا اظہار میرے اکثر افسانوں سے ہوتا ہے۔ میں اسوقت تک کوئی افسانہ نہیں لکھ سکتا جب تک اس "واردات" یا "واقعہ" کا نقشہ میرے تصور میں نہ کھچ جائے۔

افسانہ جس وقت میرے ذہن میں آتا ہے تو مکمل آتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ حالت ہوتی ہے کہ میں دو دو تین تین افسانے ایک وقت میں لکھنے بیٹھ جاتا ہوں، ایک لکھنے سے طبیعت اکتائی تو دوسرا لکھنے لگا اور اگر اس سے دل اچاٹ ہوا تو تیسرا قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح دو تین نشستوں میں

یہ افسانے مکمل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ مہینہ مہینہ بھر کوئی افسانہ نہیں سوجھتا۔ اور بسا اوقات ایک معمولی سا واقعہ افسانے کی داغ بیل ڈال دیتا ہے، اس کے لئے دو ایک مثالیں خالی از لطف نہ ہوں گی۔

میرے چند افسانوں میں سے ایک "رادھا کی کنٹھی" ہے (اور جہاں تک میرا خیال ہے یہ افسانہ مقبول عام ہے)۔ بھکسر کے قریب دریائے سندھ پر مگھ کا شکار کھیل کر واپس آ رہا تھا، ایک جگہ خانہ بدوشوں کے جھونپڑے تھے، یہاں میں ذرا سستانے کی خاطر بیٹھ گیا، سامنے ایک درخت پر جھولا پڑا ہوا تھا، اور ایک نابینا لڑکا جھولے پر بیٹھا تھا، اور ایک لڑکی اسے جھلا رہی تھی، پھر وہ لڑکی جھولے پر بیٹھی اور نابینا بچہ جہاں اس لڑکی نے اسے کھڑا کر دیا تھا۔ وہیں سے ہاتھ آگے بڑھا کر لڑکی کو جھولا دینے لگا۔ میں کچھ دیر بیٹھا یہ تماشہ دیکھتا رہا، رات کو جب مکان پر پہنچا تو ایک نیا ریکارڈ

ع "ایک جھولا ڈالا میں نے سیّاں کی گود میں"

آیا رکھا تھا یہ ریکارڈ میں نے کئی بار بجا کر سنا' اور اسی شب "رادھا کی کنٹھی" جو دلوں کی پاک محبّت کا ایک دلسوز افسانہ ہے لکھا۔

"نیرنگ" دہلی کے کسی سالنامہ میں میرا ایک افسانہ "زود پشیماں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اور بقول مدیر نیرنگ "نیرنگ نوازوں" نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ اس کی کیفیت بھی سن لیجیے۔

مدیر "نیرنگ" لاہور تشریف لائے ہوئے تھے' مجھ سے ملنے آئے تو انہوں نے سالنامے کے لئے افسانہ لکھنے کو کہا۔ اور صرف تین دن کی مہلت دی میں نے معذرت کی لیکن وہ نہ مانے۔ اگلے روز جب وہ پھر تشریف لائے تو انہوں نے پھر تقاضا کیا۔ اور میں نے پھر اپنی مجبوری ظاہر کی' کیونکہ دماغ میں کوئی پلاٹ آتا ہی نہ تھا' تیسرے روز رات کو تشریف لائے صبح انہوں نے دہلی واپس جانا تھا' میں نے ہر طرح انہیں یقین دلانا چاہا کہ میں حقیقت میں مجبور ہوں لیکن ان

کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے انکار سے ان کی دلشکنی ہوئی ہے، جب وہ چلنے لگے تو میں بازار کی نکڑ تک انہیں چھوڑنے ساتھ آیا، یہاں ایک بوڑھا مچھلی تلکر بیچتا تھا اُسی جگہ کھڑے ہو کر انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اسوقت ایک پیر کہن سال ایک چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھائے اسے مچھلی کھلا رہا تھا۔ بچی جب اپنا ہاتھ مچھلی کی طرف بڑھاتی تو وہ بڑی محبت سے کہتا۔

"ٹھہرو بیٹا! میں کانٹا نکالدوں"

ایک دو بار جو میں نے یہ محبت بھرے الفاظ سنے تو پھر اس شخص کی پیرانہ سالی اور بچی کی معصومیت نے میرے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ اور میں نے مدیر صاحب سے کہا کہ لیجئے حضرت! کل صبح افسانہ لے جائیگا، اسوقت تو غالباً وہ یہی سمجھے کہ میں ان سے مذاق کر رہا ہوں۔ لیکن اسوقت میرے دماغ میں ایک افسانے کا مکمل پلاٹ موجود تھا، اسی شب میں نے "زود پشیماں" کے عنوان سے افسانہ لکھ لیا۔ صبح وہ تشریف لائے تو میں نے ان کو پڑھ کر سنایا۔ آخری حصے پر جب پہنچے

تو یہ حالت تھی۔ کہ اپنی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، اور میری آواز اسقدر بھرا گئی تھی کہ بمشکل سے الفاظ منہہ سے نکل سکتے تھے۔

"ساقی" دہلی کے امسال کے سالنامے کے لئے جو افسانہ سہاگ کی رات کے عنوان سے لکھا ہے۔ اسکی تحریک صرف اس شعر سے ہوئی کہ ؎

حجلۂ گور میں سامان عروسی ہوگا
لاش آرام سے سوئیگی سہاگن بنکر

گرمی کے موسم میں سردیوں کی نسبت زیادہ لکھتا ہوں، گرمیوں میں عموماً بارہ بجے دوپہر سے تین بجے تک ایک بھیگی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر اور بجلی کا پنکھا لگا کر لکھتا ہوں اور پھر چار سے پانچ یا چھ تک سوتا ہوں میرے خیال میں سخت گرمی، کا وقت کاٹنے کے لئے یہی موزوں طریق ہے، میز پر بیٹھ کر میں لکھنے کا عادی نہیں، میز پر بیٹھ کر مسودہ صاف کر کے لکھتا ہوں۔ میری میز اور کباڑی کی دکان میں صرف اسقدر فرق ہوتا ہے۔ کہ میز چھوٹی ہے اور کباڑی کی دکان بڑی مجھے طویل عبارت لکھنا

پسند نہیں۔ مکالمہ لکھنے میں لطف آتا ہے۔ وہ افسانے جو مجھے پسند ہوں کسی استاد کے شعر پر ختم کرتا ہوں۔

نیاؔز فتحپوری

میری زندگی میں سب سے پہلے یہ سوال مجھ سے ۱۳ جولائی ۳۳ء کو کیا گیا اور وہ بھی اسقدر اچانک کہ تھوڑی دیر کے لئے تو میرے ذہن نے اس استفسار کے سمجھنے کی بھی اجازت نہیں دی۔

ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال نے یہ سوال (جسے مطالبہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) کیوں کیا؟ اس پر تو خیر پھر کبھی غور کرونگا لیکن اسوقت تو یہ فکر لاحق ہے کہ اس سوال کا جواب کیا دوں، جبکہ مجھے خود نہیں معلوم کہ "میں افسانہ کیونکر لکھ لیتا ہوں"۔

حکیم صاحب کا مکتوب گرامی پڑھنے کے بعد میں نے افسانہ نگاری کی عمر اور اس کی مختلف کیفیات پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ بجائے خود ایک افسانہ ہے اور کہیں ایسا نہ ہو

کہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، افسانہ از افسانہ می خیزد کی الجھنوں میں مبتلا ہو جاؤں۔

اس سوال کے جواب کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، ایک وہ جس کا تعلق صرف میری ذاتی ذہنیت سے ہے اور دوسرا جو فن سے متعلق ہے لیکن غالباً فنی حیثیت سے کوئی گفتگو مناسب نہ ہوگی اس لئے اِس مسئلہ کو مجھے صرف اپنی ہی " اہلیت" تک محدود رکھنا چاہیئے۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب بات (جو غالباً اصول افسانہ نگاری کے بالکل خلاف ہے) میں اپنے اندر یہ پاتا ہوں کہ آج تک میں نے کوئی افسانہ پلاٹ متعین کر کے لکھا ہی نہیں، یہانتک کہ بعض اوقات تو میں اس سے بھی بے خبر ہوتا ہوں کہ "زیر تحریر" لفظ کے آگے دوسرا لفظ مجھے کیا لکھنا ہے، لیکن چونکہ اکثر و بیشتر میرے افسانوں کا آغاز "تجزیۂ سیرت" (Characterisation) سے ہوتا ہے اس لئے ابتدا ہی میں کچھ ہلکے سے نقوش دماغ میں ایسے ضرور پیدا ہو جاتے

ہیں جو پلاٹ کی تخلیق میں غیر ارادی طور پر معاون ہوتے رہتے ہیں۔
میرا طویل ترین افسانہ (اور غالباً اسی حد تک مقبول بھی)
"شہاب کی سرگزشت" ہے لیکن اس کی ترتیب بھی اسی طرح ہوئی کہ ہر ماہ چند صفحات نخدان کو بھیجکر بالکل خالی الذہن ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ چھپکر سامنے آتے تھے تو پھر بغیر کسی پلاٹ کے تعین کے ایک جزو اور لکھ دیتا تھا، یہانتک کہ جب میں نے اس کے ختم کرنے کا ارادہ کیا تو میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا انجام کیا دکھاؤں لیکن چونکہ اس فسانہ کا عنصر جوہری (nucleus) مسئلہ نکاح اور فلسفہ لذت و مسرت پہلے سے متعین ہو چکا تھا اور اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ ایسا پیش آ گیا جس سے "انتخاب از دواج" کے مسئلہ پر مجھے زیادہ غور کرنا پڑا۔ اس لئے میں نے اس فسانہ کو بھی اسی کیفیت کے تحت ختم کر دیا۔

میرا سب سے پہلا افسانہ "ایک شاعر کا انجام" جو ۱۹۱۳ء میں لکھا گیا تھا۔ وہ بھی یونہی بغیر پلاٹ کے تعین کے لکھا گیا تھا، اور سب سے آخری "شبستان" کا قطرہ گوہر

میں "اجو ۳۲ء میں لکھا گیا، وہ بھی اسی طرح مکمل ہوا — اس سے ثابت ہوا کہ یہ "مذموم" عادت میری فطرت ہے اور میں اسکو ترک نہ کر سکنے پر مجبور ہوں۔

اسی سلسلہ میں ایک سوال تحریک کا بھی پیدا ہوتا ہے، یعنی کسی فسانہ کے لکھنے کا کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہیئے۔ سو اس باب میں بھی میرا تجربہ کچھ ایسا ہی عجیب و غریب ہے یعنی نصف افسانے تو میں نے یقیناً کسی نہ کسی تحریک کے بعد لکھے ہیں، لیکن نصف ایسے ہیں جن کے لئے سوائے اس کے کوئی تحریک نہ تھی کہ "مجھے افسانہ لکھنا چاہیئے" لیکن یہ عجیب بات ہے دونوں طرح کے لکھے ہوئے افسانے بعد کو ایک ہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں افسانے کے لئے کوئی تحریک موجود تھی اور فلاں کے لئے نہیں۔

بعض افسانوں کی ابتدا تو میں نے اس طرح خالی الذہن ہو کر کی ہے جیسے کوئی داستان گو یہ کہنا شروع کر دے کہ "ایک بادشاہ تھا، اور اس کے ایک بیٹا تھا۔" لیکن اس کے

بعد کیا کہنے والا ہے؟ اسے خود بھی معلوم نہیں۔

یہاں تک تو عمومی تبصرہ ہوا۔ "تخلیق افسانہ کے متعلق رہ گئے جذبات" سو ان کی تفصیل دشوار بھی ہے، اور کافی وقت بھی چاہتی ہے۔ لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ افسانہ میں خواہ کسی طرح اور کسی حال میں لکھوں۔ لیکن ہیرو اور ہیروئن کی ایک تصویری Ideal ہستی ضرور میرے سامنے ہوتی ہے جس کا ایک مخصوص خیال اور مخصوص صفات کے ساتھ تعارف کراتا ہوں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مجھے نہ پلاٹ کی چنداں ضرورت ہوتی ہے نہ کسی اجمالی یا تفصیلی خاکہ مرتب کرنے کی۔

میں ایک افسانہ کو کبھی ایک نشست میں پورا نہیں کر سکتا۔ (الا اس صورت میں۔ کہ وہ بہت ہی مختصر فکاہی رنگ کا ہو) آدھ گھنٹہ تک مسلسل لکھنے کے بعد کم از کم دس منٹ مجھے خیال کی رو میں تقویت پیدا کرنے کے لئے ضرور درکار ہوتے ہیں۔ خواہ یہ وقت میں صرف پان کھانے میں صرف کر دوں یا سامنے پڑے ہوئے پردہ کے رنگین نقوش پر غور کرنے میں۔

کسی شخص کی موجودگی میرے کام میں حائل نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو اور نہ کسی مقام کی تعیین در کار ہوتی ہے۔ بشرطیکہ میں وہاں بے تکلف ہوں۔

کاغذ، قلم، و دوات جس قدر نفیس ہوں گے، اُسیقدر پاکیزگی کے ساتھ میں ایک مضمون کی ابتدا کر سکوں گا، گو لکھنے کے دوران میں مجھے یہ خبر نہیں ہوتی کہ قلم کبھی سرخ دوات کی طرف چلا جاتا ہے، اور کبھی سیاہ کی جانب جس جگہ میں کام کروں اس کا صاف ستھرا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اگر میرے کمرے میں کسی جگہ ایک تنکا بھی پڑا ہو گا۔ تو میں اس وقت تک نہ لکھ سکوں گا۔ جب تک اُسے اٹھا کر نہ پھینک دوں۔

جاڑے میں افسانہ لکھنے کی کیفیت مجھ پر زیادہ تر رات کو طاری ہوتی ہے۔ جب میرا ماحول محوِ خواب ہوتا ہے۔ اور شمع میری تنہا انیس ہوتی ہے۔ گرمیوں میں طلوعِ آفتاب سے پہلے لکھ لوں تو لکھ لوں۔ اس کے بعد کوئی لطیف بات نہیں سوجھتی، بارش میں اگر سرد ہوا چل رہی ہو، اور تمازتِ آفتاب بالکل معدوم ہو تو میں لکھ

پڑھ سکتا ہوں ورنہ نہیں۔ الغرض آفتاب اور اس کی روشنی سے میرے دماغ کو ازلی بیر ہے۔ اور مجبوری کا تو خیر ذکر نہیں۔ کہ جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں بعض اوقات دفتر کے دفتر میں نے لکھ ڈالے ہیں، لیکن بے اختیارانہ طور پر لکھنے کے لئے مجھے انتہائی خوشگوار موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔

سلطان حیدر جوشؔ

اس سوال کا نہایت معقول اور مختصر جواب تو یہ ہو سکتا ہے۔ کہ میں افسانہ اسی طرح لکھتا ہوں جس طرح کہ لکھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سوال اپنی موجودہ صورت میں بہت کچھ مضحکہ انگیز ہے۔ یہ مانا کہ میرا افسانہ انداز بیان اور اظہار جذبات میں اوروں کے افسانوں سے بالکل جداگانہ ہو، مگر محض اس بنا پر یہ سوال کرنا کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں قابل تسلیم نہیں۔ یقیناً میری رفتار اور گفتار بھی ہزاروں چلنے پھرنے اور بولنے چالنے والوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مگر غالباً اس بنا پر آج تک کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ میں راستہ کیونکر چلتا ہوں اور بات چیت کس طرح کرتا ہوں۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اسی قدر لکھ کر ساری داستان ختم کر دیتا مگر جناب سیّد

فرید جعفری مچھلی شہری کا یہ نفس نفیس ورود اور کسی طرح نہ
رفع ہونے والا اصرار مجبور کرتا ہے کہ میں ایک چھوٹی سی بات
کو افسانہ بنا دینے پر تیار ہو جاؤں۔

سب سے پہلی بات جو مجھے افسانہ نگاری کے متعلق
یاد ہے کہ میں نے افسانہ کسی خاص طرز میں بالخصوص موضوع
پر، کبھی ایک فرمائش کی تعمیل میں نہیں لکھا۔ عمر بھر میں صرف
ایک مرتبہ غالباً ۱۹۳۰ء میں مجھ سے "عشق کی گولیاں" کے
تحت میں اپنے اصول سے ہٹنے کی خطا سرزد ہوئی ہے، لیکن
ایڈیٹر کی ضد اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ "زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ
پینا ہوگا" اور جو کچھ میں نے اس موقع پر لکھا اس کو میں افسانہ
نہیں سمجھتا۔ میری رائے میں ایک مقررہ طرح میں غزل لکھنا
اس قدر گناہ نہیں ہے جس قدر کہ ایک تجویز کردہ موضوع پر
افسانہ لکھنا۔ آزادیٔ تخیل اور رعنائیٔ بیان اس قسم کی قیود سے
ناقابل برداشت حد تک زائل ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ہمیشہ افسانہ اس وقت

لکھا جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی، کبھی یہ تحریک دفعتاً وجود میں آئی اور کبھی مہینوں میں اس حد تک پہنچی کہ میں پوری طرح اس کو محسوس کر سکا۔ اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے، کبھی صحبت احباب کبھی ریل کا سفر، کبھی کسی نئے مقام کی سیر اور کبھی غیر معمولی واقعات کا مشاہدہ مثلاً ہردوئی میں احباب کی ایک بے تکلف صحبت میں دفعتاً جو تحریک پیدا ہوئی وہ اس مضمون کا باعث ہوئی، جس کی سرخی تھی "نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں"۔ یا نینی تال کا پہلا سفر اس افسانہ کا باعث ہو جس کا عنوان "ہاں نہیں" ہے۔

ایسی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار کے لئے افسانہ بنانا ہے یہ مرحلہ اکثر و بیشتر میں نے رات کی تنہائی میں اور کچھ نہیں تو حقہ کی امداد سے، پلنگ پر لیٹے ہوئے طے کیا، واقعہ یہ ہے کہ تحریک صادق کے ساتھ محض ایک خیال، ایک مخصوص جملہ، ایک غیر معمولی تصویر یا ایک

نیا مصالحہ دماغ میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اس مخصوص تحریک کو افسانہ کے سانچے میں ڈھالنا بالکل ایسا ہی کام ہے جیسے گوندھی ہوئی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ برنگ کھلونے بنانا، اس میں شک نہیں۔ کہ تحریک مذکور جب کبھی ایک سامعہ نواز آواز، ایک باصرہ فریب صورت یا ایک جاذب توجہ منظر سے پیدا ہوئی تو ہمیشہ دیرپا اور دلچسپ تخیل کا باعث ہوئی میری رائے میں یہ کیفیت بھی ارادتاً پیدا نہیں کی جا سکتی اور جب کبھی پیدا ہو جائے، تو بہترین تخیل اور طرز بیان کی بنیاد بنائی جا سکتی ہے

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ معمولی سی تحریک پیدا ہو جائے پر صرف چند خیالات ہی نوٹ کر سکا اور انکی تکمیل دوبارہ ویسی ہی تحریک وجود میں آنے تک ملتوی رہی۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ بعض اوقات ایک مکمل افسانہ ایک ہی مرتبہ کی تحریک سے وجود میں آگیا، اور بعض اوقات اس کی تکمیل تحریک فطری کی تکرار پر مبنی رہی۔

آخر میں صرف یہ بتانا رہ جاتا ہے کہ میں اظہار تخیل

میں ارادتاً کن باتوں کا لحاظ رکھتا ہوں۔ لیکن آپ کا سوال ان امور سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور اُن کو دو تین مختصر جملوں میں بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر موضوع یہ ہوتا کہ میں افسانہ میں کیا باتیں ضروری سمجھتا ہوں اور اس کا لحاظ کیونکر رکھتا ہوں تو اس پر اظہار رائے کی ضرورت ہوتی۔ میاں فرید جعفری مطمئن ہیں کہ ان کے سوال کا جواب ہو گیا اور شکر کا مقام ہے کہ شکایت رفع ہو گئی۔ مدیر معلومات کا مقولہ ہے کہ "گویئے کے دو بول" کافی ہوتے ہیں اور میں تو پوری آستائی اور انترا الاپ چکا ہوں۔

24

مجنوں گورکھپوری

"میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"؟ یہ سوال آج مجھ سے کچھ پہلے پہل نہیں کیا گیا ہے۔ "زیدی کا حشر" (جو یقیناً میرا پہلا افسانہ تھا) لکھنے کے بعد سے اب تک مجھ سے صرف دو سوال کئے جا رہے ہیں، انہیں سے ایک تو مطالبہ تھا یعنی یہ کہ سوا افسانہ کے کچھ نہ لکھوں دوسرا واقعی استفسار تھا یعنی "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"؟ حیرت ہے کہ نیاز صاحب اتنے دنوں تک اس سوال سے کیونکر بچے رہے۔ سنا ہے سب سے پہلے ان سے یہ سوال ۴ جولائی ۱۹۳۳ء میں ایڈیٹر نیرنگ خیال نے کیا خیر میرے لئے یہ سوال خاصا پرانا ہو چکا ہے۔ البتہ میں نے کبھی اس کا جواب پوری ذمہ داری کے ساتھ عوام کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ آج پہلی مرتبہ سوچ سمجھ کر سنجیدگی اور نظم و

تذبذب کے ساتھ اس سوال پر غور کرنے کی نوبت آئی ہے۔

نیرنگ خیال ہی نے مجھ سے بھی یہ سوال کیا ہے۔ جناب سید فرید جعفری میرے پاس نیرنگ خیال کے لئے کوئی افسانہ لینے کی غرض سے تشریف لائے تھے اور میں ان سے وعدہ کر چکا تھا کہ کوئی افسانہ لکھ دوں گا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وعدہ کو پورا کرنے کی نیت کہاں تک تھی۔ اتنے میں خود جعفری صاحب کی رائے ہوئی کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" کے عنوان سے سب لکھ چکے ہیں کیوں نہ میں بھی لکھوں۔ یقین مانیئے میں نے اس وقت جعفری صاحب کے مشورہ کو اپنے حق میں ایک قسم کی بشارت سمجھی۔ میرے پڑھنے والوں کو شاید اچھی طرح یہ نہیں معلوم کہ اب میں افسانہ لکھنے سے جی چرانے لگا ہوں۔ اس کا سبب دراصل خود مجھ کو معلوم نہیں لیکن جسقدر معلوم ہے اس سے اپنے پڑھنے والوں کو وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہا ہوں۔ اور آج بھی ممکن ہے اس کا ذکر آجائے۔

بہرحال میں نے افسانہ لکھنے سے یہ لکھنا زیادہ آسان سمجھا تھا، کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"۔ لیکن جب ارادہ کر کے لکھنے

بیٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ کیسی کوہ کنی ہے۔ اس سے تو ہزار بار یہ آسان تھا کہ میں کوئی افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا اور اس کو برا بھلا ختم کر کے ایڈیٹر کے حوالہ کر دیتا۔ وہ افسانہ در اصل چاہے کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کو ایڈیٹر صاحب بھی پسند فرماتے اور میرے پڑھنے والے بھی اس لئے کہ نام اور ساکھ دنیا میں بڑی چیز ہے۔ میں افسانہ نگاری میں ایک ساکھ تو قائم ہی کر چکا ہوں جو کچھ لکھ دیتا اس کو مجنوں گورکھپوری کا افسانہ تو سمجھا ہی جاتا۔ لیکن "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟" یہ تو میرے لئے اچھا خاصا معمہ ہے جسکو مجھ سے زیادہ شاید دوسرے حل کر سکتے تھے۔ خیر اب تو مجھ ہی کو حل کرنا ہے۔ اپنے کئے کا علاج ہی کیا ہے؟ جو سودا خود مول لیا گیا ہو اس کو نباہ دینا ہی بہتر ہے۔

میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی کا نصب العین افسانہ لکھنا نہیں تھا۔ میں اپنے کو نہ جانے کیا کیا سمجھے ہوئے تھا اور نہ جانے کیا کیا ہونا چاہتا تھا اور نہ جانے کیا کیا ہو سکتا تھا مگر ان بہت سی آرزوؤں کا ذکر ہی کیا جو خاک ہو چکی ہوں۔ نشاط

اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت میں افسانہ لکھنے لگا۔ جاننے والے
جانتے ہیں کہ میرا سب سے پہلا افسانہ "زیدی کا حشر" لاگ ڈاؤنٹ
میں لکھا گیا۔ یہ ایک عورت کی تحریک تھی۔ اسکو نیازؔ صاحب
کے "شہاب کی سرگزشت" کا جواب سمجھنا شاید زیادہ غلط نہ
ہو اس کے بعد ہی نیازؔ صاحب نے اصرار کے ساتھ مجھے یہ سمجھانا
شروع کیا کہ میرے اندر افسانہ نگاری کی صلاحیت بحدّ اتم موجود
ہے اور میں کچھ نہ کروں صرف افسانے لکھوں۔ قصہ مختصر مجھے افسانہ
نگار اس عورت نے اور نیازؔ صاحب نے بنایا۔ چنانچہ قیامت
کے دن مواخذہ الٰہی دونوں سے ہوگا۔ اور میرے ہاتھ میں اگر
ایک طرف اس عورت کا آنچل ہوگا تو دوسری طرف نیازؔ صاحب کا
گریبان بھی ہوگا۔ اب اس کے بعد میں افسانے کیونکر لکھتا رہا؟
یہ در اصل اتنے سوالوں کا ایک سوال ہے جتنے کہ میں نے لکھے
ہیں میں اس سے پہلے اصرار کرتا رہا ہوں کہ میں کبھی اپنے افسانوں
میں قصد و اہتمام کے ساتھ کوئی نظریہ یا عقیدہ نہیں پیش کرتا۔
یہ سچ ہے لیکن یہ بھی کچھ کم سچ نہیں کہ میرے افسانوں میں میری

شخصیت اور میرے مزاج وطبیعت کا کافی امتزاج ہوتا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ میرے افسانوں کا محرک صرف مطالعہ یا مشاہدہ نہیں بلکہ وہ مبہم اور غیر متعین جذبہ ہوتا ہے جسکو بالعموم "عبرت" کہتے ہیں اور جو ایک ذاتی اور داخلی کیفیت کا نام ہے۔ بچپن سے میرا میلان حکمت و فلسفہ کی طرف تھا اور زندگی کے نت نئے مسائل پر غور و فکر کرنے میں مجھے بڑی لذت ملتی تھی۔ اب جبکہ میں نے افسانہ نگاری شروع کی تو میرے اس میلان کا بھی مظاہرہ ہونا ضروری تھا۔ اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہوتا رہتا ہے۔ البتہ چونکہ افسانہ بہرحال افسانہ ہوتا ہے اس لئے میرے اپنے معتقدات و افکار اپنی پوری عریانی اور اصلیت کے ساتھ کبھی ظاہر ہونے نہیں پاتے۔ اس لئے کہ "زیب داستان" کے لیے برابر کچھ نہ کچھ بڑھانا یا گھٹانا پڑتا ہی ہے۔

مجھ پر یہ محض اتہام ہے کہ میرے افسانے عموماً مغربی افسانوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر سرسری طور پر میں کئی مرتبہ اظہار خیال کر چکا ہوں۔ میں نے کبھی "نقش ثانی" کی

نقاشی نہیں کی ہے میں نے کتابوں کے مطالعہ سے کبھی اس وقت تک کام نہیں لیا۔ جب تک میرے مشاہدہ اور خارجی تجربہ نے اس کی تائید نہیں کی اور اپنے مشاہدہ اور تجربہ کو اس وقت تک اہم اور قابل اعتنا نہیں سمجھا جب تک کہ ان سے میں کوئی خاص اور اہم نتیجہ نہ نکال سکا ہوں۔ اور مجھے کوئی "عبرت" نہ حاصل ہوئی ہو اور جب مجھے کوئی "عبرت" حاصل ہوتی ہے۔ تو پھر میں کتابوں کے مطالعہ کو بھی اسی حد تک کام میں لے آتا ہوں جس حد تک کہ زندگی کے واقعات و تجربے کو میرے متعلق رشید صاحب کی یہ رائے (اگر محض انکی ظرافت نہیں ہے) کچھ زیادہ صحیح نہیں کہ میں نے اپنی شخصیت کی تہذیب و تکمیل زندوں سے نہیں مردوں سے کی ہے۔ ہاں میں نے زندوں کے طوفان میں مردوں کو کبھی کھو نہیں دیا ہے۔ میں نے مردوں میں بھی ایک زندگی پائی ہے اور زندوں کی زندگی سے اس کی مطابقت کرتا رہا ہوں۔ بعض لوگ مردوں سے اسی طرح ڈرتے ہیں جس طرح کتے کا کاٹا پانی سے ڈرتا ہے۔ رشید صاحب اور میرے والد صاحب دونوں اسی

جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ "میت کا خوف
دراصل موت کا خوف ہوتا ہے۔ یہ لوگ ماضی سے انکار کر کے
اور حال کو بھولے رہ کر چاہتے ہیں کہ مستقبل کی سنگینی کے
احساس کو محو کر دیں۔ مگر یہ ہوتا نہیں۔ اگر زندگی نام ہے تجربہ کا
جیسا کہ میرا خیال ہے رشید صاحب بھی کہہ دینگے۔ اگر ہمارے
تجربات جو بہر حال ماضیات ہوتے ہیں مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں
اگر مستقبل دفعتاً آسمان سے ٹپک نہیں پڑتا تو ہم کو اپنے ماضی
کا جائزہ لیتے رہنا ہے۔ ہم کو گڑے ہوئے مردے اس لئے اکھاڑنا
ہیں کہ زندوں کا حال اور آئندہ کی زندگی میں بغیر ان مردوں کے
کام چلتا نظر نہیں آتا اور پھر ہم نہ صرف اپنے تجربات سے فائدہ
اٹھاتے ہیں بلکہ دوسروں کے تجربات کو بھی اپنی ملکیت سمجھ کر
کام میں لاتے ہیں۔ اگر انسان اپنی زندگی کی بنیاد صرف اپنے
ذاتی تجربات پر رکھتا تو آج اس کی عمر اتنی بھی نہ ہونے پاتی جتنی
کہ اس کا جگ بیں ہے۔ مگر میں ایک غیر متعلق بحث کو خواہ مخواہ اس
قدر سنجیدگی کے ساتھ طوالت دے رہا ہوں۔ مجھے رشید صاحب

سے صرف ایک شکایت ہے یعنی یہ کہ انہوں نے اپنی رائے کے اظہار کے لئے بیکار والد صاحب کی آڑ اختیار کی۔ مگر اُن سے کسی بات کی شکایت ہی کیا۔ والد صاحب نے ان سے فرمایا تھا" مسخرے بھی ہو اور لونڈے بھی" میں اتنا کہنے کی جسارت تو کر نہیں سکتا۔ یہ ضرور کہونگا کہ رشید صاحب صرف ظریف نہیں ہیں ستم ظریف ہیں اور ان کی کسی بات کا گلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس طول کلام سے مقصد اسقدر تھا کہ میرے افسانے کبھی نہ صرف مشاہدہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نہ صرف مطالعہ کا۔ میری فسانہ نگاری کی محرک "عبرت" ہوتی ہے جو میرے مشاہدہ اور مطالعہ دونوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کو چند مثالوں سے سمجھئے۔

"زیدی کا حشر" لکھنے کو تو لاگ ڈانٹ میں لکھا گیا۔ یہ افسانہ میری طبیعت کی ہلکی جولانی تھی اور اگرچہ اس کی میرے ذہن میں کوئی قدر نہیں تاہم نہیں کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ میرا طبعزاد افسانہ ہے۔ لیکن اس کی پوری روداد سننے کے لائق ہے اس

میں زبیدی اور حسینن دونوں ایسی شخصیتیں ہیں جن سے اس دنیا
میں میرے دوستانہ تعلقات رہ چکے ہیں۔ زبیدی ایک ایسی
ہستی کا تخیلی نقش ہے جس کو میں نے زندگی میں پہلی بار اپنا
ہم مزاج و ہم نوا پاکر اپنا دوست سمجھا۔ اور جس کا حشر واقعی کچھ
اسی قسم کا ہوا۔ میرے تجربہ میں یہ دوسری موت تھی جس کو میں
نے محسوس کیا اور مجنونانہ شدت کے ساتھ محسوس کیا لیکن کبھی
اس کا گمان بھی نہیں تھا اسکو افسانہ بنا کر پیش کرنے کی نوبت
آئے گی۔ افسانہ کی تقریب تو اسی عورت کی تحریک تھی یا پھر نیاز
صاحب کا افسانہ "شہاب کی سرگزشت" پھر یہ بھی سمجھئے کہ اس
وقت تک ادب و فلسفہ کا میں نے جسقدر مطالعہ کیا تھا افسانہ
لکھتے وقت سب کو کام میں لے آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ
آسکر والڈ۔ برناڈ شا۔ ابسن اور اس قسم کے دیگر مغربی انشاپردازوں
سے میں بے انتہا متاثر تھا۔ اور چیستان نگاری کی طرف مائل تھا
انہی سب باتوں نے اس افسانے میں وہ تکلف و تصنع پیدا کر
دیا ہے جس کی بنا پر میں نے وصیت کی ہے کہ اس افسانے کو

کبھی میرے کسی مجموعہ میں شامل نہ کیا جائے۔ حالانکہ جن واقعات سے اس کی ترکیب ہوئی وہ میرے لئے نہایت نازک یادگاریں ہیں

"زیدی کا حشر" میں حسنین کی زندگی اس کی منطقی یا تخیلی انتہا کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ خیال تھا۔ کہ کبھی اس تخیل کی بھی تکمیل کرونگا لیکن اسی دوران میں میں نے دو ناول The Scarlet کا Nathanial HawThorme اور ٹولسٹائی . Anna Kareninso پڑھے جس سے تخیل اور تجربہ دونوں کو مدد ملی نتیجہ "حسنین کا انجام" تھا لیکن پڑھنے والے کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ "حسنین کا انجام" اور ان دونوں ناولوں میں اگر کوئی نسبت ہے تو وہ بہت دور کی ہے۔

"خواب وخیال" میرا سب سے زیادہ طبعزاد افسانہ ہے یہ چند ایسے صبر آزما لمحات کی یادگار ہے جبکہ میں موت کو اس کی پوری عریانی اور تاریکی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ جبکہ نیستی فطرت کی بے دردی، خدا کی قہاری اور انسان کی بے مائگی

اور بیچارگی کی ایسی شدید اور روح فرسا جھلک مجھے نظر آئی کہ آج
تک حواس بجا نہیں ہوئے لیکن ناظرین کو معلوم ہو جائے گا
کہ اس افسانے میں بھی مطالعہ کا کچھ کم اثر نہیں ہے۔ بالخصوص
شوپنہار۔ ہارڈی۔ لیوپارڈی اور فارسی اور اردو شاعری کی
عام قنوطیت کے اثرات نہایت تیز رنگ میں نمایاں ہیں۔

یہ تین مثالیں کافی ہیں۔ میرا ہر افسانہ کم و بیش ایسا ہی
ہوتا ہے۔ میرا تخیل "عبرت" کے جذبہ سے متحرک ہوتا ہے۔ اور مطالعہ
اور مشاہدہ دونوں سے مواد فراہم کر کے افسانے تیار کرتا ہے۔
جو میلان مجھے اول اول فلسفہ کی طرف لے جا رہا تھا وہی اب
عبرت کی صورت اختیار کئے ہوئے افسانہ نگاری میں کام
آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح نگاری مجھے نہیں آتی۔ لوگوں کو مجھ سے
یہ شکایت ہے کہ مجھ میں ظرافت کی کمی ہے۔ میں زندگی کو اس قدر
گراں اور سنگین پاتا ہوں کہ اس کو ہنس کر ٹال نہیں سکتا۔ میں
زندگی کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرنے سے فطرتاً معذور ہوں۔ یہ
ہے میری فسانہ نگاری کی بنیاد۔ اب میں چند ایسی باتوں کا

بھی ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو میری فسانہ نگاری کے لوازمات سے ہیں۔

میں اسوقت تک کوئی افسانہ نہیں لکھ سکتا جبتک کہ میرے ذہن میں کوئی خاص تخیل موجود نہ ہو یعنی ہمیشہ "اتنی سی بات" ہوتی ہے جسکو میں افسانہ کر دیتا ہوں۔ تخیل کے ماتحت میں قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتا ہوں۔ اسوقت مجھے خارجی اور ذہنی دونوں قسم کے سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے تو نہایت عام سی بات لیکن میری زندگی میں خارجی اور ذہنی سکون میں عجیب نسبت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھے ذہنی سکون میسر ہے اور اس نے ہر خارجی شور و انتشار کو اپنے اندر جذب کر کے سکون بنا لیا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محض خارجی سکون نے ذہنی سکون پیدا کیا ہو۔ اگر میں اندرونی ہیجان و انتشار میں مبتلا ہوں تو خارج کا سارا سکون یکسر اضطراب و انتشار ہو جاتا ہے۔ اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ میرے لئے ہر وہ خارجی حالت شور و ہیجان ہے

جس سے میری طبیعت کو کوئی مناسبت نہ ہو۔ اور جس کو میں نے اپنی ہستی کا ایک لازمی جزو نہ بنا لیا ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ نازک دماغی ہے۔ کہ اگر لکھتے وقت مرغ نے بانگ دے دی یا ملازم نے کسی ضرورت کا اظہار کیا یا کسی نے آکر کہا "چلیے کھانا کھا لیجئے" تو میری جھلاہٹ کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور میرے خیالات کا تمام شیرازہ ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر میرے بیوی بچے میرے پاس آکر گھنٹوں کھیلتے کودتے اور دخل در معقولات کرتے رہیں تو میرے کام میں کوئی خلل واقع نہیں ہو گا۔ بلکہ اس سے میرے قلم کی قدرت بڑھ جائے گی میں ہر پانچ منٹ کے بعد ان سے دو باتیں بھی کرتا جاؤں گا۔ ان کے مشغلہ میں شریک بھی ہوتا رہونگا۔ اور میرے خیالات کا سلسلہ کہیں سے منقطع نہ ہو گا۔ غرضیکہ افسانہ لکھنے کے لئے میرے ماحول کا مجھ سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ورنہ میں فلسفہ لکھ سکتا ہوں تنقیدیں لکھ سکتا ہوں سیاسیات و معاشرت پر بحث کر سکتا ہوں۔ مگر افسانے نہیں لکھ سکتا

مجھے سونے اور فسانہ نگاری دونوں کے لئے ایسے ہی سکون کی ضرورت ہے اس خیال کا ایک مرتبہ الوان کے ایک اداریہ میں بھی اظہار کر چکا ہوں۔ کچھ عرصہ سے اپنے ماحول کو اپنی فطرت اور اپنی زندگی سے بے آہنگ پاتا رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر ایک افسانہ بھی ایسا نہیں لکھ سکا جس کی میری نگاہ میں کوئی وقعت ہو۔ اور اب جو کچھ دنوں سے علیگڈھ میں آ پڑا ہوں تو فسانہ نگاری کی رہی سہی قوت بھی سلب ہوتی نظر آ رہی ہے۔ ایک تو یہاں ابھی میں اپنی خارجی زندگی کو اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق نہیں بنا سکا ہوں دوسرے یہ کہ رشید صاحب لاکھ مجھ سے اختلاف کریں۔ علی گڑھ کی سرزمین "فسانہ خیز" بالکل نہیں ہے کم سے کم یہاں کی زندگی میں ایسی کوئی چیز مجھے نظر نہیں آتی جو میرا افسانہ بن سکے۔

اسی سلسلہ میں بعض اور باتیں ہیں جو آپ کو عجیب معلوم ہونگی۔ میں صرف رات کے وقت لکھ سکتا ہوں اور

جسدن زیادہ خفا ہوتا ہوں اس دن زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ لکھتا ہوں۔ پھر جسدن کھانا کم کھاتا ہوں اس دن زیادہ لکھ سکتا ہوں۔ اور زیادہ دلچسپ اور لطیف باتیں لکھ سکتا ہوں۔ شاید علیگڈھ میں کچھ نہ لکھ سکنے کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ میں یہاں بھر پیٹ دونوں وقت کھانا کھاتا ہوں کچھ اس لئے نہیں کہ بھوک زیادہ لگتی ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اب کچھ دلنوں سے جو یہ دستور زندگی کا نکل آیا ہے تو یونہی سہی یا پھر شاید اس لئے کہ علیگڈھ میں اور کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تو لاؤ کھانا ہی کھاتا رہوں اس سے پیشتر سالہا سال تک یہ دستور رہ چکا ہے کہ صرف ایک وقت اور وہ بھی شام کو کھانا کھاتا تھا۔ اور اپنے کو ہلکا اور لطیف محسوس کرتا تھا۔ اگر مجھے بخار چڑھا ہو تو میں زیادہ پاکیزہ چیزیں لکھ سکتا ہوں۔ یہ صرف افسانوں پر صادق نہیں آتا بلکہ عام مرقومات پر بھی بخار کی حالت میں میں نے خط بھی زیادہ دلچسپ لکھے ہیں۔ اور امتحان کے پرچے بھی

لیکن اگر بخار کے ساتھ زکام بھی ہو تو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ سگریٹ اور چائے کثرت سے پیتا ہوں۔ اگر بیوی زیادہ محاسبہ اور مواخذہ کرنے پر نہ تل گئیں۔

میں ایک ہی نشست میں زیادہ سے زیادہ لکھ ڈالنے کی کوشش کر ڈالتا ہوں ورنہ خیالات میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ میری یہ عادت صرف فسانہ نگاری سے متعلق ہے۔ اور ہر ایک قسم کی چیزیں بغیر کسی طرح کی دقت یا خرابی کے مختلف نشستوں میں لکھ سکتا ہوں۔ لیکن کسی افسانہ کے لئے جتنا ہی مجھے ایک نشست میں لکھ ڈالنے کا کم موقع ملے گا اتنا ہی وہ افسانہ کم درجہ کا نکلے گا۔ اس طرف کوئی اچھا افسانہ نہ لکھ سکنے کا شاید ایک سبب یہ بھی ہو کہ مجھے یکسوئی کے ساتھ ایک نشست میں لکھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔

اب آپ لوگوں کو احساس ہوگا کہ میں کسقدر عجیب الخلقت ہوں اور افسانے لکھنا میرے لئے کسقدر

دشوار اور خطرناک ہے میں ایسا کیوں ہوں؟ آپ کے ذمہ دار خارجی اسباب اتنے نہیں ہیں جتنا کہ میری نفسیات یہ بالکل دوسری بات ہے کہ میری نفسیات کی تشکیل میں اول اول خارجی اسباب کا بھی کچھ نہ کچھ دخل رہا ہو مگر یہاں یہ بحث ہی غیر متعلق ہے۔ اور بات بڑھ بھی گئی۔

سو واسطے خدا کے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

جلیل قدوائی

آپ کا خط جس میں افسانہ نگاری کے متعلق سوال کیا گیا
ہے مجھے اسوقت میں پہنچا تھا جب کہ میں بیمار پڑا تھا۔ اس
وقت سے ابتک آپ کے پے در پے کئی معمولی اور رجسٹری
شدہ خطوط بھی ملے مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے پہلے جواب نہ
دلسکا، شاید آپ کو معلوم نہیں ہیں وسط ماہ مارچ سے یعنی
آپ سے الہ آباد میں ملاقات ہونیکے بعد سے بُری طرح بیمار
ہوں۔ اور ابتک زیر علاج ہوں شاعری اور تکلف برطرف،
دل و جگر اور پھیپھڑوں کی بیماری ہے اور عام جسمانی و ذہنی کمزوری جسکی
وجہ سے ڈاکٹری مشورہ کے مطابق الہ آباد سے علیگڈھ واپس پہنچتے
ہی مکمل آرام کے لئے مجھے یونیورسٹی سے پانچ ماہ کی رخصت لینی
پڑی، خدا کا شکر ہے کہ اب پہلے کی نسبت بہت آرام ہے اور

ہر چند کہ ابھی لکھنے پڑھنے کے کام میں دوبارہ ہاتھ نہیں ڈالا ہے مگر آپ کے متواتر تقاضوں اور شکایت ناموں سے مجبور ہو کر یہ تھوڑی سی سطریں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ کہ آپ نے مجھے اردو کے افسانہ نویسوں کی فہرست میں جگہ دی اور یہاں تک جگہ دی کہ مجھے افسانہ نگاری کے متعلق سوال کیا ہے مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو میری طرف سے یہ حسن ظن کیوں ہے میں نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ابتک افسانوں کے صرف دو مجموعے شائع کئے ہیں اور تیسرا مجموعہ بھی شاید نکل جائے اسلئے کہ دو چار افسانے ایسے رہ گئے ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں کئے جا سکے ان افسانوں میں سے بھی آدھے سے کچھ زائد ترجمے ہیں۔ باقی تھوڑے سے میرے اپنے ہیں گویا جس طرح غالبؔ نے کہا تھا ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آساں نہیں صاحب دیواں ہونا

کچھ اسی طرح بلاتشبیہ میں بھی کہہ سکتا ہوں "اے حضرات!

آپ کے افسانوں میں سے آدھے سے زائد تو دوسروں کے ہیں
پھر کس برتے پر تتا پانی؟" اس کا جواب مجھ سے نہیں آتا غالبؔ
کے "ڈیڑھ جزو" کے دیوان کے بعد "نسخہ حمیدیہ" ظہور میں آیا، لیکن
میری بساط تو بہت ہی مختصر ہے...... بہرحال میرے لیے آپ کی
بخشی ہوئی عزت کی حفاظت ضروری ہے اور یوں بھی جس سوال کا
جواب آپ کی مصلحت پر واجب ہو اس کے جواب کی فکر میں
کیوں سر کھپاؤں بہتر یہی ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل میں اصل
سوال کی طرف توجہ کروں جو مجھ سے کیا گیا ہے۔

میں آپ کے سوال کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکا۔ کیونکہ
آپ نے سوال کے صحیح الفاظ مجھے لکھ کر نہیں بھیجے لیکن آپ کے
سوال کا جو عام مفہوم میری سمجھ میں آیا، اسے ذہن میں رکھ کر مختصراً
جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ اس
بیان میں مجھے بہت جگہ پر اپنی کمزوریوں کا اعتراف و مظاہرہ
کرنا پڑیگا۔ اور میں جا و بیجا الزام اور ملامتوں کا شکار بنوں گا
مگر ؎

عشق کا آزار جو چاہے کرے!

آپ کی دوستی میں معشوقوں کی دوستی کی طرح نفع کم اور ضرر زیادہ ہے، اسلئے انتو سر بازار رسوا ہونا پڑا"

میں نے افسانہ نویسی کے فن پر دو چار کتابیں ضرور پڑھی ہیں، اور کہیئے تو آپ کے ناظرین کو اُن کے حوالوں سے اور جن اصولوں کا ان میں ذکر ہے ان کی تفصیل و تشریح سے مرعوب کروں مگر مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے اس کی توقع نہ کریں گے کیونکہ اول اول تو میں آپ کے پرچے کے ناظرین کو بہت باخبر سمجھتا ہوں دوسرے میں بیمار ہوں اور یہ سر مغزی میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہوگی اسلئے جس طرح آپ کا سوال کم و بیش ذاتی ہے۔ اسی طرح جواب میں مجھے اپنے ذاتی خیالات و تجربات بیان کرنے دیجئے۔

میرا اصول افسانہ نگاری اس مقولہ میں مضمر ہے، انسان کے لئے بہترین مطالعہ خود انسان ہے" اور میں بلا کسی پس و پیش کے اقبال کرتا ہوں کہ میری کہانیاں یا تو میرے اپنے سوانح حیات

ہیں یا چشم دید واقعات و حالات یا دوسروں کی بپتیاں جنہیں میں نے جن پر بیتی ان کی زبان سے سنا اور کبھی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر کہا میرے بہت سے دوست میری کہانیوں کے اصل پلاٹ سے باخبر ہیں کیونکہ خود میرے ساتھ شریک نیز کی حیثیت سے شامل تھے، اور جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے انہیں دوستوں کے نام کہانیاں معنون کی ہیں جو کہانی کے راز سے آشنا ہیں، مجھے کہانیوں میں "واقعیت" اور "صداقت" بہت پسند ہے اور زندگی کی سچی تصویر کشی کو میں افسانہ نگاری کا پیارا اور سب سے بڑا اصول سمجھتا ہوں مجھے اردو کے افسانہ نویسوں سے مایوسی اور شکایت ہے کہ وہ یہ راز نہیں سمجھتے اور یہ کیا نہیں سمجھتے، افسانہ نگاری کا آرٹ نہیں سمجھتے خلاف واقعہ یا محیر العقول داستانیں وقت اور کاغذ دونوں کا اسراف ہیں، اور دماغ کی توہین۔ کیونکہ وہ ہمیں اپنے کو، اپنے ماحول کو، اپنی ذہنی کشاکش کو اپنی روح کی جد وجہد و ہیجانی کو ـــــ اپنی زندگی کے پیچ در پیچ مسائل اور مشکلات کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دیتیں میں آرٹ

کو خوشحال اور بےفکر لوگوں کی تفریح طبع اور عیاشی کا باعث ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک باکار اور مفید چیز سمجھتا ہوں۔ اسلئے میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ زندگی سے بے نیاز ہو کر اپنا علیحدہ وجود نہیں برقرار رکھ سکتا۔ میں ہر آرٹ میں زندگی سے ربط و تعلق ڈھونڈتا ہوں جس سے ہماری روح ہم آہنگ اور آسودہ ہو سکتی ہے۔ اردو میں اسی لئے مجھے سوائے منشی پریم چند کے افسانوں کے جس میں مختلف دیگر کام کی باتوں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ دیہاتی زندگی اور اوسط ہندوستانی انسان کے جذبات و خیالات کی نقاشی ہوتی ہے اور سجاد حیدر صاحب کے بعض افسانوں کے جو زندگی کے چند نہایت سچے روحانی پہلوؤں کی دلکش تصویریں ہیں۔ کسی کی کہانیاں پسند نہیں۔ مگر سجاد صاحب کی ایسی کہانیاں کم ہیں اور وہ بھی ترجمے ہیں۔ وہ مواد سے زیادہ طرز انشاء کے دلدادہ ہیں۔ مجیب صاحب نے چند کہانیاں بلشبہ اچھی لکھی ہیں آپ کے پنجاب میں بھی بعض نوجوان لکھنے والے اس گر کو سمجھ چکے ہیں اور چند عمدہ کہانیاں پچھلے دنوں اس اصول کے

ماتحت پنجاب کے رسالوں میں نظر پڑیں، اصل میں انگریزی اور فرانسیسی میں بھی یہ چیز زیادہ نہیں ملتی۔ ہاں بعض روسی مصنفوں نے اس دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے ان کے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کے بیباک پردہ دری کا بے پناہ سمندر پڑا موجیں مارتا ہے۔ اور انہوں نے واقعی افسانہ نویس کے فرائض کی اہمیت کو سمجھا ہے۔

اردو میں ایک اور چیز عام ہو گئی ہے اور ہر چند کہ اسے زندگی سے خارج نہیں کیا جا سکتا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسی سے زندگی میں گداز اور لطف ہے لیکن صرف اسی ایک چیز کو زندگی بھی نہیں کہہ سکتے، میری مراد عشق کے عنصر سے ہے۔ وہ بھی نہایت سستا اور اُچھے قسم کا عشق افسانوں میں ضرورت سے زیادہ اور بلا وجہ عشق کا عنصر کیوں داخل کیا جا رہا ہے؟ اے کاش ہماری زندگی عشق ہی میں بسر ہوتی! اگر یہ صحیح ہے کہ لٹریچر قوم کی زندگی کا آئینہ ہے اور اس کی ذہنی تاریخ اور ہم دل سے زیادہ پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہیں، اور بہتر نظر سے زیادہ فکرِ معاش کے مارے

ہوئے تو پھر یہ عیاشی اور بےفکری بےحسی اور بزدلی کسی طرح معافی
کے قابل نہیں جس طرح ہماری زندگی روزی کے کاروباری
فرائض ذمہ داریوں، مشکلات، مقابلوں اور بیشمار پیچیدہ اور
دشوار مسائل کا مجموعہ ہے جس میں عشق کو ثانوی حیثیت حاصل
ہے اس ثانوی حیثیت میں بھی آپ یہ مانیں گے کہ عشق شروع
سے آخر تک یکساں پرخروش نہیں رہتا اور ثانوی در ثانوی
حیثیت حاصل کر لیتا ہے اسی طرح کہانیوں میں بھی کبھی کبھی اس
کا ذکر ہو یا کوئی خاص افسانہ نویس اسی ایک چیز میں امتیاز
پیدا کر لے تو مضائقہ نہیں لیکن آخر یہ کیا کہ جس شخص کے ہاتھ
میں قلم آیا۔ اسے عشق کے موضوع کے علاوہ کوئی دوسرا مضمون
ہی نہیں ملتا۔ کیا ہمارے ادیب اور افسانہ نویس ذہنی اعتبار
سے ایسے مفلوج و بیکار ہو گئے ہیں کہ ان کے خیال کو دوسری
دنیائیں نہیں ملتیں اور یہ حالت بھی ہے جبکہ ہماری زبان بقول
شاعر؎

نام خدا ہے جواں کچھ تو چاہیئے!

میں کہاں سے کہاں بہک گیا ...... تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کہانیوں میں زندگی کی اصلی نقاشی بہت پسند ہے اسی لئے میں کوشش کرتا ہوں کہ بیتے ہوئے واقعات کی کہانیاں لکھوں، واقعہ خواہ واقعتہً پیش آیا ہو، یا وہ صرف دماغی کیفیت ہو یا ذہنی جد وجہد وغیرہ میں نے افسانوں کے لئے کبھی خود سے کیرکٹر نہیں تخلیق کئے، در اصل کیرکٹر پیدا کرنا ناول نویسوں کا کام ہے جو خاص مقصد سے قلم ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اور اپنے کیرکٹروں کی زبان سے وہ خیالات ادا کرتے ہیں جن کا انہیں پرچار مقصود ہوتا ہے، مختصر افسانہ زندگی کی بہتی ہوئی ندی کی ایک لہر ہے۔ جسے برف کی قاش بنا کر ادب کے برفستان میں محفوظ کر دینا چاہئے۔ اسی طرح میں نے پہلے سے پلاٹ بھی نہیں تیار کئے۔ اس معاملہ میں میں نے ذہن و فکر سے زیادہ قدرت سے مدد پائی جو میرے حق میں بہت فیاض واقع ہوئی ہے اسلئے میں کہتا ہوں کہ لکھنے والے کے لئے پلاٹ قدم قدم پر موجود ہے ہماری زندگی بیشمار چھوٹی کہانیوں کی

کتاب ہے۔ اور اس دنیا میں ایسی چھوٹی کہانیوں کی کتابوں کی انتہا نہیں ہے صرف پڑھنے والا چاہیئے، میرا ایک طریقہ اور ہے مجھے جو واقعہ جس طرح پیش آئے کم و بیش اسی طرح لکھ دیتا ہوں، اپنی طرف سے پلاٹ کو دلکش بنانے کے لئے شاید ہی کہیں گھٹاتا بڑھاتا ہوں شاید قدرت بڑی چابکدست مصور ہے جو واقعات کو عالم حال میں بالکل منطقی ترتیب سے پیش کرتی ہے اور لکھنے والے کے لئے حذف یا اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی یہ شاید نئی سی بات معلوم ہو مگر قابلِ غور ہے اور میرا یہی طریقہ ہے اس اصول کی تائید میں اپنی بہت سی کہانیوں کے پلاٹ پیش کر سکتا ہوں مگر مثال کے طور پر یہاں صرف ایک واقعہ تحریر کرتا ہوں، جس کی کہانی ابھی تیار نہیں ہوئی۔

کئی سال ہوئے، علیگڈھ میگزین کے ایڈیٹر صاحب نے میگزین کے جدید و سابق عملۂ ادارت کی تصویر لینی چاہی وہ گروپ لیا گیا اور رسالہ میں شائع بھی ہوا جس مقام کو تصویر لیجانے والی تھی ہم لوگ سوئمنگ باتھ لان پر جمع ہوئے

چار بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ مگر انتظار کرتے کرتے پانچ بجنے آئے، اور مصوّر کا پتہ نہ تھا، سبکو بیحد اضطراب تھا، خصوصیت کے ساتھ ہمارے ایک معزز دوست کو جنہیں ٹینس کھیلنے کلب بھی جانا تھا۔ وہ ایڈیٹر صاحب کے حسن انتظام کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُدھر ایڈیٹر صاحب جو طلبا کی جماعت کے ایک فرد تھے، نہایت پشیمان تھے اور ہم لوگوں کو پریشان دیکھ کر بھاگے بھاگے پھرتے تھے، غرضکہ بالکل مایوس ہو کر اور ایڈیٹر صاحب کی معذرت پر ان کی خطا معاف کر کے ہم لوگ وہاں سے چلے ہی تھے کہ فوٹو گرافر صاحب ایک یکّہ پر تصویر کشی کا سامان لیے ہوئے آتے نظر آئے، ہم لوگ پھر روک لئے گئے، نشست کا دوبارہ انتظام کیا گیا، اور مصوّر صاحب نے اپنے آلات ترتیب دینا شروع کیے ہمارے اُن دوست کو جن میں بہت پیچ و تاب تھا، ابتک غم و غصّہ تھا۔ اور انہوں نے نہایت متانت سے مصوّر صاحب کو قائل اور انکی غلطی متنبہ کرنے کی خاطر ان سے کہا کہ "جناب کو ۴ بجے کا وقت دیا گیا تھا، اور ہم لوگ مصروف آدمی ہیں آپ کو وقت کی پابندی لازمی تھی" مگر مصوّر صاحب کب قائل

ہونے والے تھے، انہوں نے فوراً جواب دیا "یہی تو تصویر لینے کا بہترین وقت ہے" "اس سے پہلے تصویر لی جاتی تو محنت رائیگاں جاتی"، ہمارے دوست نے پھر کہا "مگر وعدہ کا ایفا اور وقت کے تعین کا تو بہرحال خیال کرنا چاہیئے" لیکن مصوّر صاحب کی رائے اس کے خلاف تھی، اسلیئے وہ فوراً ہی بولے اور نہایت بے پروائی بلکہ بے تکلفی کے لہجہ میں "اجی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی دیر کوئی دیر نہیں" ظاہر ہے کہ اس کی منطق کو سمجھنا ہمارے قابل دوست کے لیئے دشوار تھا لہذا ہار کر انہوں نے مصوّر سے زیادہ خود اپنے سے کہا "آپ قائل نہ ہوں گے"، اس جملہ کا مصوّر صاحب سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو بیچارگی خود جواب بن گئی، انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرکے معشوقانہ انداز سے ایک بڑی لمبی جمائی لی اور نظام رامپوری کے قول کے خلاف مجسم "انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ" بنکر منہہ دوسری طرف پھیر لیا!!

اب ذرا مجھے یہ بتایئے اس قصہ میں پلاٹ کی دلچسپی کیلیئے وہ کیا چیز رہجاتی ہے جسے آپ شامل کرینگے، اس قصہ کی دلچسپی جیسی

تخیلی یا خارجی پلاٹ یا افسانہ در افسانہ کے داخل کرنے پر منحصر نہیں بلکہ ان سچے واقعات کے من وعن بیان کر دینے میں مضمر ہے۔ ایسی حالت میں اپنی طرف سے جزیات و تفصیلات کا محض پلاٹ کی دلچسپی کی خاطر اضافہ کرنا ایسا ہی بیکار ہے جیسا کہ شعر میں برائے بیت الفاظ یا غزل میں بھرتی کے الفاظ داخل کرنا، افسانہ نویسی ایک ذمہ دار اور اہم فرض ہے، اور افسانہ نویس ایک مقدس پیغامبر، پیغمبر کو آسمانی آیت یا وحی جس طرح وہ اس پر نازل ہو جوں کی توں خلق خدا تک پہنچا دینا چاہئیے۔

کچھ دن پہلے تک میں ڈائری لکھنے کا عادی تھا، روزانہ رات کو سونے سے قبل دن بھر کے واقعات کو قلمبند کر لیتا تھا اور کبھی فرصت کے اوقات میں ان اوراق کو دوبارہ پڑھتا تھا، تو کہانیوں کے لئے مسالہ مل جاتا تھا، مگر ایسا نہیں کرتا، میں اسے بیکار سمجھتا ہوں کہ آدمی اپنے اوپر یہ فرض عائد کرے کہ روزانہ اس غیر دلچسپ مشغلہ سے سر کھپائے اور نہ روزمرہ کے واقعات عام طور پر اتنے دلچسپ اور غیر معمولی ہوتے ہیں کہ وہ قلمبند کئے جائیں۔ اسی لئے ڈائری

کے واقعات میں ایک طرح کی یکسانیت آ جاتی ہے، اور وہ غیر دلچسپ ہو جاتے ہیں، ہاں کسی خاص حالت میں جب کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو یا کوئی ایسا امر جس میں ڈرامائی کیفیت ہو یا ذہن وخیال کی کوئی حالت جس سے دل اثر پذیر ہوا ہو اس کے لکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر اس حالت میں بھی اپنے لئے اسے بیکار سمجھتا ہوں جتنی دیر کوئی ڈائری کے اوراق سیاہ کرے اسی وقت میں ایک اچھی سی مختصر کہانی تیار کر سکتا ہے، ہاں ریل کے سفر میں یا سیاحت کے موقعوں پر ڈائری ضرور رکھنا چاہیئے کیونکہ اسٹیشن پر، اور ہوٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور ریل کے ڈبوں میں عموماً ایسے واقعات پیش آیا کرتے ہیں جو کہانیوں کے عمدہ پلاٹ ہو سکتے ہیں اور جنکی کہانیاں بعد میں تیار کیجا سکتی ہیں۔

قصہ لکھتے وقت میں بہت مضطرب اور بیچین ہو جاتا ہوں، شاید میرا مفہوم ٹھیک ادا نہ ہو، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جسوقت میں احساس سے بیچین ہوتا ہوں، اسی وقت نہایت اچھا لکھ سکتا ہوں۔ یہ عجیب بات ہے، مگر احساس اور تحریر میں وقفہ گزر جائے تو

لکھنا طبیعت پر بار معلوم ہوتا ہے، اور میں کام سے جی چراتا ہوں میرے پاس بعض مسودے ناتمام رکھے ہیں، یا کہانیوں کے نوٹ جو پھیلائے نہیں جا سکتے محض اس وجہ سے کہ میں نے موزوں وقت پر کام سے جی چرایا یعنی احساس کیوقت انہیں مکمل نہیں کر لیا، اور وہ جیسے کہ تیسے پڑے رہ گئے اسی قسم کا ایک واقعہ اوپر مثال میں پیش کر چکا ہوں، احساس کے وقت خیالات کی کثرت تفصیلات کی وسعت اور واقعہ کی تلخی یا علاوت کی شدت کے باعث کلیجہ پھٹ جانیکو ہوتا ہے اور خون کی حرارت اور نبض کی سرعت بڑھ جاتی ہے، سر میں شدید درد ہونے لگتا ہے، پوری کہانی خیال کے چاروں طرف منڈلاتی ہے اور دریا کوزہ میں بند نظر آتا ہے لکھتے ہوئے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں خیالات کی کثرت سے یکے بعد دیگرے دماغ میں آنے کے باعث سخت عجلت میں ایک مختصر نویس کی طرح لکھتا ہوں، لکھتا رہتا ہوں، ایک ہاتھ سے سر دبا لیتا ہوں، لکھتا چلا جاتا ہوں، تا آنکہ کہانی ختم ہو جاتی ہے، اور وہ تکلیف وہ احساس شادمانی میں بدل جاتا ہے کہانی ختم کرنے اور ایک جنس نایاب ہاتھ آنے کی خوشی مگر جب کہانی

چھپتی ہے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی مجھے اس میں بیسیوں نقائص نظر آتے ہیں، شاید میری کہانیوں کی تنقید مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا۔

میری تحریر بہت خراب ہے کم از کم میرے دوستوں اور عزیزوں کو یہی شکایت ہے گو مجھے انکی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اصغر صاحب نے ایک دفعہ لکھا "مجھے یہ حسرت ہی رہ جائے گی کہ زندگی میں ایک دفعہ تمہارا خط تمام و کمال پڑھ لیتا" ایک صاحب لکھتے ہیں "آپ کی تحریر دور سے موتیوں کی لڑی نظر آتی ہے، مگر آنکھ کے پاس لاؤ تو سوئیوں کی کھٹک محسوس ہوتی ہے" ایک مرحوم بزرگ (خدا انہیں جنت نصیب کرے) اگر شام کو میرا خط ملے تو رکھ دیتے تھے اور فرماتے تھے "اب اسے اطمینان سے صبح کے وقت پڑھیں گے" وغیرہ لیکن اس میں شک نہیں کہ کہانی لکھتے وقت یا بہت زیادہ لکھنا ہو تو میری تحریر بہت خراب ہو جاتی ہے اسی لئے کبھی کبھی لکھنے کا کام میں نے اپنی بیوی سے بھی لیا ہے، جنہیں اپنے خط پر بڑا ناز ہے اور جن کی بارگاہ سے میری تحریر کو "جناتی تحریر" کا خطاب ملا ہے، میرا اپنا

لکھا ہوا مسوّدہ نہایت کٹا پٹا، عجلت میں لکھا ہوا بہت خراب ہوتا ہے، اسے کوئی پڑھ نہیں سکتا، میں مسودہ صاف بھی بہت کم کرتا ہوں اگر نظر ثانی کی بھی تو اصل مسوّدہ ہی میں کانٹ چھانٹ کر دیتا ہوں یا نشانات لگا کر حاشیہ پر عبارت کا اضافہ کر دیتا ہوں اور اسی طرح پریس میں دے دیتا ہوں مگر حیرت ہے کہ چھاپہ خانہ والے اسے خوب پڑھ لیتے ہیں۔

کہانی لکھنے کے لئے بہترین وقت رات ہے۔ اس وقت احساس شدّت سے قوی ہوتا ہے اور خیالات خوب آتے ہیں یہاں تک کہ راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے کم از کم میرا تجربہ یہی ہے کیونکہ

اکثر شب تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر

اور یوں بھی دن کو بہتری اور مصروفیتیں رہتی ہیں مثلاً نوکری جس کے متعلق ماسٹر کیدنگ نے کہا ہے۔

نوکری بہت ہے نیچا کار — نا کرنا کبھی نوکری یار

یا دوستوں کی ملاقاتیں جن سے سجاد صاحب پناہ مانگتے ہیں "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" اور جو کبھی لکھنے پڑھنے نہیں دیتے کہتے ہیں کہ اس کا صحت پر برا اثر پڑتا ہے حالانکہ بعض کی ہمدردی سے صحت میں خلل پڑ جاتی ہے یا "لون تیل لکڑی" کی فکر یا گھر والی کی صورت دیکھتے رہنا، یا بچوں کا منہ وغیرہ دھلانا وغیرہ وغیرہ رات کا وقت سولہ آنہ اپنا ہوتا ہے اور دن کے مقابلہ میں زیادہ طویل، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رات کے وقت خیالات بھاگتے نہیں یا کم از کم ایسے نہیں بھاگتے کہ پکڑے نہ جائیں، خیالات کے پرے کے پرے آتے ہیں اور خوشی خوشی اپنے کو تحریر کے پھندے میں گرفتار کر دیتے ہیں رات کے وقت جب چولھا ٹھنڈا ہو چکا ہو اور دن بھر کا کھڑاک ختم

"وہ گھر والی سندر چتر گھر کی سیوا کرنیوالی"

بچوں سمیت سو رہی ہو، تو نخرچا کر نظروں سے دور ہوں۔

اور چاروں طرف سناٹا ہو، اُس وقت اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں حقّہ سے شغل کرتے ہوئے افسانہ لکھنے کا مزا ہے۔

وقت میں لچک پیدا ہو جاتی ہے اور خیالات میں وسعت اور گہرائی یہاں تک کہ قصہ ختم کر کے بستر پر آؤ تو بھی خیالات کی آمد کم نہیں ہوتی، اور بستر پر پڑے پڑے مسودہ میں ترمیمیں کیجاتی ہیں...

جناب حکیم صاحب! معاف کیجیے گا میں نے یہ مضمون اناؤ میں لکھنا شروع کیا تھا اور دو مہینہ بعد علیگڑھ میں آکر بھی ختم نہیں ہوا۔ مجبوراً اسے یہیں پر ختم کرتا ہوں، اس عرصہ میں آپ کے اور بہت سے تقاضے آئے اور میں بہت شرمندہ ہوں کہ اسقدر دیر سے آپ کی خدمت میں یہ سطریں بھیج رہا ہوں، اچھا ہے کہ آپ اب زیادہ نہیں ٹھہر سکتے، ورنہ خدا جانے کیا کیا ہذیانات بکتا کیونکہ اب مجھے خدا کے فضل سے صحت ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ میری طبیعت ذرا جم چلی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے آپ کے سوال کا کہاں تک شافی اور مکمل جواب دیا ہے ممکن ہے کہ آپ کو مایوسی ہو۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ میرے پاس آپ کے سوال کے اصل الفاظ نہیں تھے اسلئے بغیر ذہن

پر زور ڈالے جو خیالات فوراً ذہن میں آتے گئے انہیں قلم برداشتہ
کاغذ پر منتقل کر دیا ہے اپنی کہانیوں کی طرح اس مضمون میں کسی جگہ تصنع
اور ریاکاری سے کام نہیں لیا ، سچی سچی باتیں عرض کی ہیں خدا کرے
آپ انکی بے ربطی اور بے لطفی سے ناخوش نہ ہوں"۔

علی عباس حسینی

یہ ایک طرح کی آپ بیتی ہے، اس کا لکھنا پرائی بیتی سے مشکل ہے اس لئے پہلے ہی صاف کہے دیتا ہوں کہ میری فسانہ نویسی کے نہ تو اوقات معین ہیں نہ سامان اور نہ اصول۔ نہ تو اس کے لئے میز کرسی کی شرط ہے، نہ صبح کی ٹھنڈی ہواؤں کی، نہ خوشگوار موسم کی اور نہ شب کی تنہائیوں کی، میں نے اکثر بستر پر لیٹے لیٹے افسانہ لکھا ہے، ریل کے سفر میں بھی، حد سے زیادہ گرمی میں بھی اور بچوں کے شور و ہنگامے میں بھی، کبھی دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر لکھتا ہوں، کبھی اڈیٹروں کے تقاضے سے عاجز ہو کر اور کبھی اپنے جذبات کا محکوم بن کر! کبھی بے سوچے سمجھے قلم کاغذ لیکر بیٹھ گیا، کچھ لکھنا شروع کر دیا، خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا، پلاٹ بنتا گیا اور فسانہ مکمل ہو گیا۔ کبھی کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے کوئی اچھی بات ذہن میں آ گئی، قلم کاغذ اگر پاس ہی ہو

تو اسی کو مرکزی خیال بنا کے لکھنا شروع کر دیا، پلاٹ کا ایک دھندلا سا خاکہ ذہن کے کسی کونے میں موجود رہتا ہے، اسی میں رنگ آمیزی کر دی کبھی پورا پلاٹ پہلے ہی سے دماغ میں ترتیب دے ڈالتا ہوں اور دو تین دن غور و فکر کے بعد اسے کاغذی پیرہن پہنا دیتا ہوں لیکن سب سے زیادہ کامیاب فسانے وہی لکھے گئے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ جو واقعات میں نے اپنے گرد و پیش دیکھے ہیں انکی بعینہٖ مرقع کشی کر دی ہے، ان فسانوں کے لکھنے میں پلاٹ اپنی طرف سے بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر ان میں دماغ پر محنت سب سے زیادہ پڑتی ہے۔ ان میں فسانہ نگار کو فوٹوگرافر کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جس طرح فوٹوگرافر کسی عمارت کا فوٹو لینے میں کیمرا مختلف زاویوں سے لگا کر دیکھتا ہے کہ پوری عمارت کا فوٹو کس زاویہ سے پورا اترتا ہے اسی طرح فسانہ نویس کو بھی ان فسانوں کی ابتدا میں حد درجہ دشواری محسوس ہوتی ہے حقیقت کی تصویریں بڑی مشکل سے مکمل اترتی ہیں۔ مجھے بھی بارہا اس طرح کے فسانوں کی ابتدا بدلنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد بھی میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ میرے

ہاتھوں میں نہیں بلکہ آیندہ نسلوں کے ہاتھ ہے! خدا
کرے دوسروں کو میری طرح کی دشواریاں نہ پیش آتی ہوں!

"میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"

حصّہ دوئم

حصہ دوئم کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب کے مضامین ہمارے پاس موجود ہیں جو زیر کتابت ہے۔

(۱) پنڈت رتن چند صاحب غیر معروف جرنلسٹ (۲) سید فرید جعفری

(۳) فدا علی خنجر لکھنوی (۴) کوثر چاندپوری

(۵) ڈاکٹر اعظم کریوی (۶) اپندر ناتھ اشک

(۷) راجہ مہدی علیخاں (۸) راجندر سنگھ بیدی

(۹) کرشن چندر ایم۔ اے (۱۰) چراغ حسن حسرت

(۱۱) حاجی لق لق (۱۲) ابوالاثر حفیظ جالندہری

قیمت:۔ ایک روپیہ

پتہ:۔ دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور